کرشن چندر

ہائیڈروجن بم کے بعد

ایشیا پبلشرز، ۵ بھارگو لین تیس ہزاری دلی

پروڈکشن: اپندرناتھ چوپڑہ
کتبہ: رضا امروہوی
مطبوعہ: دہلی پرنٹنگ ورکس۔ دہلی
بار اوّل: ایک ہزار
تاریخ: اپریل ۱۹۵۵ء
قیمت: دو روپے بارہ آنے

افسانے

مصنف کی تصانیف

ہوائی قلعے
نظارے
طلسمِ خیال
ٹوٹے تارے
پرانے خدا
زندگی کے موڑ پر
گوری گھونگھٹ میں جلے
دروازہ
شکست
ان داتا
تین غنڈے
ہم وحشی ہیں
سمندر دور ہے
ایک گرجا ایک خندق
اجنتا سے آگے
پودے

صبح ہوتی ہے
نئے افسانے
جب کھیت جاگے
طوفان کی کلیاں
میں انتظار کروں گا
مزاحیہ افسانے
شکست کے بعد
پانی کا درخت
الٹا درخت
یوکلپٹس کی ڈالی
ایک روپیہ ایک پھول

ہوا کے سیٹی

بہت عرصہ ہوا میں نے ایک کہانی پڑھی تھی جس میں ہوا کے چار بیٹے تھے۔ شمالی جھکڑ، جنوبی جھکڑ، مغربی جھکڑ اور مشرقی جھکڑ۔ اور یہ چاروں بیٹے ایک بہت بڑی غار میں اپنی ماں کے پاس رہتے تھے۔ دن بھر یہ چاروں بیٹے زمین اور آسمان کی فضاؤں میں اُچھلتے کودتے پھلانگتے رہتے اور شام ہوتے ہی وہ اپنی ماں کے پاس آجاتے، جو انھیں کھانا کھلا کے الگ الگ تھیلیوں میں بند کر کے غار کے مختلف کونوں میں لٹکا دیتی۔ کیونکہ یہ چاروں بیٹے بہت شریر تھے، اور کھانا کھاتے ہی لڑنے لگتے، اور اس سے دُنیا کا بہت نقصان ہوتا تھا اس لئے ان کی ماں نے انھیں الگ الگ تھیلیوں میں بند کرنے کی ترکیب ڈھونڈ نکالی تھی۔ اُن کی ماں بڑی قوی الجثہ تھی۔ اس کا قہقہہ مردوں کی طرح بھاری اور بلند تھا۔ اور جب وہ اپنے بیٹوں کو ڈانٹنے کے لئے انھیں کھانا کھلانے کی میز پر زور سے مارتی تو چاروں جھکڑ ڈر کے مارے اپنی کرسیوں سے ہل جاتے تھے۔ وہ بڑی ہی اکھڑ، بدمزاج اور درشت لہجے میں بات کرنے والی عورت تھی۔ اور اس کے چاروں بیٹے اس سے بہت

ڈرتے تھے۔

لیکن یہ بہت دنوں کی بات ہے۔ ان دنوں میں بچہ تھا اور اس قسم کی کہانیاں پڑھتا تھا اور ان میں یقین بھی رکھتا تھا۔ آج جبکہ میری جوانی گذر چکی ہے میں دوسری قسم کی کہانیاں پڑھتا ہوں اور دوسری قسم کی باتوں میں یقین رکھتا ہوں مگر اس وقت مجھے یہ کہانی یوں یاد آئی کہ اس شام کو یعنی جس شام کا میں اب ذکر کر رہا ہوں، میں اپنے دوست کے گھر سے چائے پی کے واپس اپنے گھر جا رہا تھا۔ میرے دوست کے گھر سے میرا گھر کوئی دو میل کے فاصلے پر تھا۔ رستے میں دیوداروں کا ایک بہت بڑا جنگل تھا۔ اور گندے نالے کا اونچا پہاڑی درہ تھا جس پر بارہ مہینے برف پڑی رہتی تھی۔ مگر چونکہ سورج ابھی غروب ہوا تھا، ابھی غربی آسمان پہ اس کی روشنی باقی تھی۔ جب میں اپنے دوست کے گھر سے نکلا۔ تو میرے ہاتھ میں ایک مضبوط چھڑی تھی۔ اور رستہ دشوار گزار ہونے کے باوجود مجھے اپنے دوست کے گھر سے اپنے گھر تک سیر کرنے کی عادت تھی۔ اس لئے میں نے شمالی آسمان پر گھر کر آنے والے بادلوں کا کچھ خیال نہ کیا۔ اور اپنے دوست سے رخصت ہو کر چھڑی گھماتا ہوا اپنے گھر کی طرف چلا۔

خزاں کے آخری دن تھے، کسانوں نے اپنی فصل سمیٹ لی تھی۔ اور اب

کہیں کہیں پہاڑی ڈھلانوں پر کھیتوں میں فصلوں کے پیلے پیلے ٹھنٹھ ہی باقی رہ گئے تھے۔ گہیلوں میں چرواہے ڈھور ڈنگروں کو واپس لاتے ہوئے بنجلی بجا رہے تھے۔ اور جانوروں کے گلوں میں گھنٹیوں کی صدا اور ان کے پاؤں سے اڑتی ہوئی دھول، دھنکے ہوئے سونے کی طرح حسین معلوم ہوتی تھی۔ ہوا میں اک جاں بخش تازگی تھی۔ لیکن ابھی موسمِ سرما کی وہ خنکی نہ آئی تھی۔ جس میں جب ہوا چلتی ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا کسی نے ناک پر برف کی انگلی رکھدی، جو مجھے بہت پسند ہے۔

یونہی چھڑی گھماتے ہوئے۔ سیٹی بجاتے ہوئے، اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے میں آدھا راستہ طے کر گے دیوداروں کے جنگل کے قریب پہنچ گیا جو کنڈرے نالے کی گھاٹی پر کھڑا تھا۔ جنگل میں داخل ہوتے ہی میری ڈاک کے ہرکارے سے علیک سلیک ہوئی۔ اس نے بتایا کہ وہ آج میرے لئے بہت سی ڈاک گھر پر چھوڑ کے آیا ہے۔ اس خبر کے سننے سے مجھے اور بھی خوشی ہوئی کیونکہ یہ پہاڑی علاقہ ہے، ہفتے میں صرف دوبار ڈاک آتی ہے۔ آدمیوں کی بستیاں بہت دور دور ہیں اور آمد و رفت کا سلسلہ بہت مشکل ہے۔ ایسے دشوار گذار مقام پر جب ڈاک آتی ہے۔ تو گویا شہری تمدن کا اک تازہ جھونکا آجاتا ہے۔ اور وقت بڑے مزے میں کٹتا ہے۔ اور جب ڈاک نہیں آتی ہے تو آدمی یوں

محسوس کرتا ہے، جیسے کسی نے اسے دھڑ تک کنڈے نالے کی برف میں گاڑ دیا ہو۔

ہرکارہ مجھے سلام کر کے اپنی گھنٹی والی چھڑی ہلاتا ہوا تیز تیز قدموں سے ادھر چلا گیا جدھر سے میں آیا تھا۔ میں نے شمالی آسمان پر ایک نظر ڈالی۔ جدھر سے سیاہ بادل امڈے چلے آ رہے تھے۔ فرغل کو بڑی مستعدی سے اپنے گرد لپیٹا اور گھاٹی پر کھڑے ہوئے دیوداروں کے جنگل میں داخل ہو کر کنڈے نالے کے درے کی طرف بڑھنے لگا۔ تیز تیز قدموں سے کیونکہ ہوا میں ذرا خنکی سی آگئی تھی اور شمالی آسمان کے بادل ذرا خطرناک سے دکھائی دیتے تھے، اور بڑی تیزی سے کنڈے نالے کے درے کی طرف پرواز کر رہے تھے۔ میں نے سوچا اگر میں ان بادلوں کے آنے سے پہلے کنڈے نالے کو عبور کر جاؤں تو بہتر ہے۔ ورنہ برف و باراں کا شکار ہونا پڑے گا۔

تھوڑی دیر میں ہوا تیز چلنے لگی۔ اس کے سرد تھپیڑے میرے رخساروں کو چھونے لگے۔ اس کے تیز و تند فراٹے دیودار کی شاخوں سے اک وحشیانہ خوشی سے چیختے ہوئے گزرنے لگے۔ اور اس وقت مجھے اینڈرسن کی وہ کہانی یاد آئی جس کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ میں نے مسکرا کر اور فرغل کو اور بھی مستعدی سے اپنے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔

"ہوا کا بیٹا شمالی جھکڑ آ رہا ہے"۔

غاؤں! غاؤں! شمالی جھکڑ دیودار کے لٹھوں کو گراتا ہوا اور اس کی شاخوں کو توڑتا ہوا غصے سے بولا۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی اولے پڑنے شروع ہو گئے۔ اولے اور بارش کے بڑے چھینٹے، ہوا کے تُند فراٹے، تڑ تڑ، درختوں کے ٹوٹ کے گرنے کی آواز۔ دھائیں دھائیں پانی کا بہنا۔ چٹانوں کا ٹوٹ کر کھڈوں میں گرنا۔ اور ان سب کے اوپر شمالی جھکڑ کے بلند بانگ قہقہے۔ جیسے وہ خوشی بھری مستی میں چل رہا ہو۔ جیسے اس کے لئے یہ سب ایک کھیل ہو۔ بچوں کا تماشہ ہو۔

تھوڑی دیر میں چاروں طرف دھند چھا گئی۔ رستہ نظر نہیں آتا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ کئی دفعہ تو میں کھڈ میں گرتے گرتے بچا۔ میرے جوتے بھیگ گئے تھے۔ میرے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ میرا سارا جسم بھیگ گیا تھا۔ پھر بھی میں چل رہا تھا۔ اس لئے کہ اس جنگل میں طوفان سے کہیں پناہ نہ تھی۔ آگے آنیوالے درے کی سنگلاخ برفیلی بلندیوں میں بھی کہیں پناہ نہ تھی۔ ہاں اگر میں نے کنڈے نالے کو پار کر لیا۔ تو اس کے دوسری طرف —— میرا گھر تھا۔ جلتا ہوا الاؤ تھا۔ آرام تھا، سکون تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنی رفتار دوچند کر دی۔ گو دھند گہری ہو رہی تھی، مگر یہ رستہ میرا برسوں کا جانا پہچانا تھا۔ اس لئے

یہ رستہ مجھے ٹھیک اپنے گھر لے جائے گا۔

بہت دیر تک میں اس دھند میں چلتا رہا۔ دھند گہری سے گہری ہوتی گئی۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ اندھیرے کے ساتھ ساتھ طوفان بھی بڑھنے لگا۔ مگر نہ گھاٹی ختم ہوئی، نہ جنگل۔ کنڈے نالے کا درّہ نہیں نظر آیا۔

کہیں میں رستہ تو نہیں بھول گیا؟

کنڈے نالے کے درّے میں ایک خوبی ہے۔ وہاں پہنچ کر زور سے آواز لگاؤ۔ تو آواز گھوم گھوم کر چار پانچ دفعہ گونج گونج کر لوٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

میں نے زور سے آواز دی۔ ہاہا آ!

'ہاہا آ!' میری آواز زور سے چلاتی ہوئی۔ بارش میں بھیگتی ہوئی۔ ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی رات کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔ کہیں سے کوئی گونج نہ سنائی دی۔

'ہاہا آ!'۔ میں نے پھر زور سے آواز لگائی۔

غاؤں! غاؤں! جواب میں شمالی جھکڑ زور سے چلّایا۔

اب میں واقعی رستہ بھول گیا تھا۔ کچھ پتہ نہ تھا کدھر جا رہا ہوں، کہاں جا رہا ہوں۔ ہر درخت اور ہر جھاڑی سے دھند لپٹی ہوئی تھی اور

ہر کھائی کھڈ کو دھند نے بھر دیا تھا، جس سے وہ خطرناک طور پر گھاٹیوں سے ہموار اور ہم سطح معلوم ہوتی تھی۔ ہر قدم پر موت کا اندیشہ تھا۔ پھر بھی میں چل رہا تھا۔ کیونکہ سردی کے مارے دانت بج رہے تھے اور سارا جسم سنسنانے لگا تھا۔ اگر میں نے چلنا بھی چھوڑ دیا تو سردی کے مارے میرا جسم منجمد ہو جائے گا۔

تھوڑی دیر چلنے کے بعد مجھے سفید دھند میں ایک اونچا سا دروازہ دکھائی دیا۔ وہ دروازہ جیسے ہوا میں معلق تھا۔ اس کے چاروں طرف دھند چھائی ہوئی تھی۔ مارے خوشی کے میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اور میں جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ اور بڑی بیقراری سے دستک دینے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور ایک بڑھیا نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی لالٹین تھی۔ اس نے لالٹین اوپر اٹھا کے مجھے اچھی طرح سے گھورا۔ پھر بڑی سختی سے بولی۔ "کیا ہے؟"

"مسافر ہوں۔ رستہ بھول گیا ہوں۔ طوفان میں گھر گیا ہوں۔"

دروازہ شمالی جھکڑ کے مکوں کے زور سے کھل گیا۔ بڑھیا نے میری طرف پیٹھ موڑ کے کہا۔ "اندر چلے آؤ۔"

اندر گیا تو ایک بہت بڑی غار نظر آئی۔ بہت اونچی اور بہت گہری۔ کئی

ہزار فٹ اوپر، غار کے اوپر چٹانیں اندر سے پھٹ گئی تھیں اور قدرتی روشندان سے بن گئے تھے۔ ان روشندانوں کے باہر برف کی جمی ہوئی تہیں ابھی تک نظر آ رہی تھیں۔

میں نے غار کے ادھر ادھر نظر دوڑائی کچھ جانا پہچانا سا غار معلوم ہوا۔ ایک کونے پر آبشار گر کر کھڈ میں جا رہا تھا۔ اندر ہی اندر بہت سی چٹانوں پر عجیب و غریب جھاڑیاں کھڑی تھیں۔ چھت سے برف کے بڑے بڑے فانوس ٹنگے ہوئے تھے۔ بلور سے بھی بڑھ کر خوشنما اور خوبصورت۔ غار کے وسط میں ایک بہت بڑی میز تھی اور اس کے سرے پر ایک جسیم نوجوان اپنی بھوری ڈاڑھی کھجاتا ہوا بیٹھا تھا۔ اس نے ایک سفید رنگ کا سموری غرغل پہن رکھا تھا اور جب وہ مسکراتا تھا تو اس کی آنکھیں بجلی کی طرح چمکتی تھیں۔ اور جب وہ ہنستا تھا تو اس کے منھ سے اولے گرتے تھے۔

یکایک بڑھیا نے کہا۔ "یہ میرا بیٹا شمالی جھکڑ ہے۔ ابھی ابھی تمھارے ساتھ آیا ہے۔"

یکایک مجھے سب یاد آ گیا۔ میں ہوا کے غار میں تھا۔ میرے سامنے شمالی جھکڑ ایک کرسی پر بیٹھا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

"رستے میں میں نے تمھیں خوب پریشان کیا نا؟" شمالی جھکڑ نے قہقہہ لگاتے ہوئے پرمسرت لہجے میں کہا۔ "ہاہاہا۔"

"میں تمھیں ایک گہری کھڈ میں پھینکنے والا تھا۔ مگر پھر میں نے چھوڑ دیا۔ ہاہا۔"
"تم اسے کھڈ میں پھینک دیتے تو میں تمھیں فوراً اس تھیلے میں بند کر دیتی"۔
اب میری نظر دیوار میں لگے ہوئے بڑے بڑے تھیلوں پر گئی۔
چار تھیلے تھے۔

میں نے بڑھیا سے پوچھا" تمھارے باقی تین بیٹے کہاں ہیں؟"
بڑھیا نے بڑی سختی سے پوچھا۔ تمھیں کیسے معلوم ہے کہ میرے تین بیٹے اور بھی ہیں؟"

میں نے کہا:" اس سے پہلے میں اس غار میں آچکا ہوں۔"
"کب۔ کیسے؟"
"ایک کہانی کے ساتھ"۔

"بڑھیا زور سے ہنسی۔ تمھارے ایسے احمق کے لئے میرے پاس کوئی پانچواں تھیلہ نہیں ہے، ورنہ تمھیں اس میں بند کر دیتی۔ اس غار میں کوئی نہیں آسکتا۔ یہ تو میرے بیٹے شمالی جھکڑ کے آنے کا وقت تھا کہ میں دروازے پر تمھیں مل گئی۔ ورنہ تمھیں تو اس غار کا دروازہ بھی نہ ملتا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اب تم آگئے ہو تو اس الاؤ کے پاس آجاؤ۔ ورنہ تمھاری ہڈیاں تک سردی سے چٹخ جائیں گی۔ میں تمھارے لئے دودھ اور شہد لاتی ہوں"۔
شمالی جھکڑ نے ہونٹ چاٹتے ہوئے کہا۔" مجھے بھی بہت بھوک لگی ہے ماں!"

"تمھیں بھی سب کچھ ملے گا۔ مگر پہلے تم اپنے دن بھر کے کام کی رپورٹ تو بتاؤ"۔ بڑھیا نے مجھے دودھ اور شہد سے لبریز پیالہ دیتے ہوئے کہا۔

شمالی جھکڑ نے کہا۔ "میں قطب شمالی سے آرہا ہوں۔ وہاں میں دیر تک آرورا بوریالس کی روشنیوں سے کھیلتا رہا۔ سفید ریچھوں کو برف پر دوڑتے ہوئے دیکھتا رہا۔ گلیشیر آدھے سے زیادہ پانی میں ڈوبے ہوئے تھے اور ایک دُخانی جہاز برف کو کاٹتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے ایک ہوائی جہاز سے دوڑنے کا مقابلہ کیا جو پہلی بار قطب شمالی پر پرواز کر رہا تھا۔ وہ تیز دوڑا تو میں اس سے بھی تیز دوڑا۔ پھر وہ مجھ سے بھی تیز دوڑا۔ تو میں اس سے بھی تیز دوڑا۔ مگر آخر کار وہ مجھ سے آگے نکل گیا۔ آدمیوں کا پہلا ہوائی جہاز جس نے قطب شمالی پر پرواز کیا اور نئی دُنیا اور پرانی دنیا کے درمیان سب سے نزدیک ترین راستہ دریافت کیا"۔

بڑھیا بڑے غور سے سُن رہی تھی۔

شمالی جھکڑ نے کہا۔ "وہاں سے میں نیچے اتر کر سائبیریا کے تیگا میں چلا گیا۔ اور لکڑی کی برف گاڑیوں سے بندھے ہوئے تیز رفتار کتوں کے ساتھ دوڑتا رہا۔ تیگا میں نئے نئے شہر تعمیر ہو رہے تھے۔ نئے نئے کارخانوں کی چمنیوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ اور دُور تک سینکڑوں میل تک پہلی بار فصل بوئی جا رہی تھی۔ اور لاکھوں آدمی گندھے

سے کندھا ملائے کام کر رہے تھے۔ گندم کا علاقہ اب تیگا تک آن پہنچا ہے ماں!"

بڑھیا کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ وہ کچھ کہنے والی تھی کہ اتنے میں دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ وہ میری طرف مڑ کر کہنے لگی "یہ میرے بیٹے جنوبی جھکڑ کی دستک ہے۔ میں اسے خوب پہچانتی ہوں۔ یہ میرا سب سے پیارا اور چہیتا بیٹا ہے۔ یہ جنوبی سمندروں سے آتا ہے اور میرے لئے ہمیشہ طرح طرح کے تحفے لے کے آتا ہے"۔

بڑھیا بھاگی بھاگی دروازے کی طرف گئی۔ جہاں اس کا بیٹا پھر دستک دے رہا تھا۔ اتنے میں ادھر شمالی جھکڑ جلدی سے اپنی کرسی سے اٹھا اور اس نے دودھ کا بھرا ہوا ایک بڑا مٹکا اٹھا لیا اور اسے غٹا غٹ پی گیا۔ اس کے بعد اس نے شہد کا ایک بڑا مٹکا اُٹھا لیا اور اسے بھی ایک لمحے میں خالی کر دیا۔ پھر وہ واپس آ کے اطمینان سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اتنے میں دروازے پر زور کی ایک چیخ بلند ہوئی۔ ہم دونوں نے گھبرا کر ادھر دیکھا۔ بڑھیا گھبرائی ہوئی پریشان حال اپنے بیٹے جنوبی جھکڑ کو سہارا دے کر لا رہی تھی۔

جنوبی جھکڑ کی آنکھیں نیلگوں تھیں۔ ماتھا فراخ۔ اور سر پر طوطے کے ہرے پنکھوں والی ٹوپی تھی۔ وہ اپنے گلوں میں جنوبی سمندروں کے

کے جزیروں کی خوبصورت رقاصاؤں کے سرخ پھولوں والے ہار پہنے ہوئے تھے اور کوڑیوں کی مالائیں۔ اس کے سینے پر پاملپاز کی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ اور جب وہ چلتا تھا تو اس کے قدموں میں لاکھوں چراگاہوں کے گلّوں کی دل کش گھنٹیاں سنائی دیتی تھیں۔

مگر آج اس کے سر پہ طیطے کے ہرے پنکھوں والی ٹوپی جلی ہوئی تھی۔ اس کے گلے کے سرخ پھول مرجھا گئے تھے۔ اس کے سینے کی ہری گھاس زرد ہو چکی تھی۔ اور جب وہ چلتا تھا تو اس کے قدموں میں موت کا ارغنوں سنائی دیتا تھا۔ وہ دھیمے دھیمے قدموں سے اپنی ماں کا سہارا لے کر میز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور میں نے دیکھا کہ اس کے داہنے رخسار سے لے کر داہنے بازو تک جسم پر بڑے بڑے آبلے دکھائی دے رہے تھے۔

شمالی جھکڑ نے اپنی کرسی سے اُٹھ کر بڑے غصے سے کہا۔ "تمھیں کس نے مارا ہے بھائی؟ میں سالے کا سر توڑ دوں گا۔ اسے زندہ برف میں گاڑ دوں گا۔"

جنوبی جھکڑ ہانپتا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ماں بھاگی بھاگی اس کے لئے دودھ اور شہد کا مٹکا لائی۔ دودھ اور شہد پی کر جنوبی جھکڑ کی طبیعت ذرا بہلی تو اس کی ماں نے اس سے پوچھا۔

"میرے بیٹوں کو زمین سے لے کر آسمان تک آج تک کوئی زیر نہیں کر سکا۔ بتاؤ وہ کون ظالم ہے۔ جس نے تجھے یہ آبلے اور زخم دیئے ہیں۔ میں اس کا خون پی لوں گی۔"

جنوبی جھکڑ نے ماں کو زبردستی کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "پہلے تم میری بات تو سن لو۔ میں قطب جنوبی سے آ رہا تھا۔ میں نے وہیل مچھلی کے شکار کرنے والے جہازوں کی مدد کی۔ سمندروں میں لہریں پیدا کیں۔ لہروں میں رستے بنائے۔ گرم پانی کی رو کو ٹھنڈے پانیوں میں لے گیا اور دونوں کو ملا دیا۔ پھر میں جنوبی جزیروں میں ناریل کے پتوں سے کھیلتا رہا۔ اور خوبصورت عورتوں کے ہوائین رقص دیکھتا رہا۔ میں بادلوں کو اڑا کر برازیل کے جنگلوں میں لے گیا۔ اور ہوانا میں لاکھوں گھوڑوں کی ٹاپوں کے ساتھ دوڑتا رہا۔ دوڑتے دوڑتے جب میں تھک گیا اور سہ پہر قریب آنے لگی تو میں نے گھر کی راہ لی۔ ہولے ہولے چلتا ہوا میں جب صحرائے نواد امیں سے گزر رہا تھا تو یکایک کسی نے زور سے ایک گولہ میرے اوپر پھینکا۔ ایک لمحے کے لئے ایسی تیز و تند چمک پیدا ہوئی جس کے سامنے کروڑوں بادلوں کی بجلیاں ماند تھیں۔ دوسرے لمحے میں ایسی حدت پیدا ہوئی جیسے سورج خود زمین پر اتر آیا ہو۔ ہولے ہولے ایک زرد۔ نارنجی اور اودے رنگ کا بادل میرا گلا گھونٹنے لگا۔ میں کھانستا چیختا چلاتا ہوا

صحرائے نوادا میں سے بھاگا۔ لیکن پھر بھی یہ دیکھو۔ میرے جسم پر آبلے پڑ گئے ہیں۔ اور میرے سر کی کھال سُرخ ہو کر اترتی جا رہی ہے۔"

بڑھی ماں آبدیدہ ہو کر اپنے بیٹے کے قریب جانے لگی کہ جنوبی جھکڑ نے چلا کر کہا۔ "میرے قریب مت آؤ ماں۔ لوگ کہتے ہیں یہ زہریلا دھواں بڑا خطرناک ہوتا ہے جس سے بھی چھو جائے اس کی کھال اترنے لگتی ہے۔"

ماں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اتنے میں دروازے پر ایک اور دستک ہوئی۔ ماں مڑ کر دروازے کی طرف جانے لگی۔ دروازہ کھلا اور پھر ایک دلدوز چیخ پہلے سے بھی بھیانک اور بلند سُنائی دی۔ ہم سب گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے کہ اب یہ کیا شامت آئی۔ ماں زاروقطار رو رہی تھی۔ اور سر پیٹ رہی تھی اور اس کے پیچھے اس کا تیسرا بیٹا مشرقی جھکڑ لنگڑاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اس کے سر کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے جسم پر جگہ جگہ سے کھال اتر کر لٹک رہی تھی۔ اور اس کے بازوؤں اور ٹانگوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اور وہ ایک آنکھ سے اندھا ہو چکا تھا۔ مشرقی جھکڑ ایک چینی تھا۔ اور اپنے گھر میں وہ سب سے زیادہ دانشمند۔ زیرک اور بُردبار مانا جاتا تھا۔ اس کی رپورٹ جو وہ ہر شام اپنی ماں کو لا کے سُناتا تھا سب سے عمدہ ہوتی تھی۔ کہ اس نے بہت کچھ دیکھا تھا۔ درد اور غلامی انسانوں کی لوٹ کھسوٹ، ایک قوم کا دوسری قوم پر غلبہ۔ لوہے ٹین

چائے اور کوئلے کے لئے انسانوں کے گوشت کی خرید و فروخت ۔اس نے بہت سے آنسو دیکھے تھے ۔ اور بہت سی سختیاں اور لاتعداد چھوٹی چھوٹی خوشیاں ۔ ننھی مُنّی مسرّتیں ۔ جیسے کام کرتے کرتے تھک جانے کے بعد ایک چھوٹا سا جگنو کی طرح چمکتا ہوا گیت ، ایک نگاہ محبت سے مسکراتی ہوئی ۔ انگلیوں کا لمس کسی انجان خوشبو کی طرح مہکتا ہوا ۔ انسان ہزاروں تکالیف کے بعد بھی زندہ رہا تھا ۔ اس نے اپنے ماحول کو اپنے خون کی قربانی دے کر بدلا تھا ۔ اور آج مشرق میں تولید کی نئی نئی کونپلیں اُگ رہی تھیں ۔ لوگ ٹوٹے پھوٹے گھروں کو تعمیر کر رہے تھے ۔ اجڑے ہوئے کھیتوں میں بیج بو رہے تھے ۔ دُور دُور تک چین میں اور جاپان میں، برما میں اور ہند چینی میں ، ہندوستان میں اور سیلون میں چھوٹے چھوٹے لوگ بند باندھ رہے تھے ۔ نہریں کھود رہے تھے ، اور لکڑی کی کھردری تختیوں پر بڑی محنت سے الف بے تے لکھ رہے تھے ۔ مشرقی جھکڑ نے جاپان کی چیری کے شگوفوں سے افسانے سُنے تھے ۔ ہوانگ ہو کے چینی ملاحوں سے محنت کا راگ سُنا تھا ۔ اس نے برما میں چاول کے سرسبز و شاداب کھیتوں کے بالوں میں بڑے پیار سے اپنی انگلیاں پھیری تھیں ۔ اور ہندوستان کے کارخانوں میں مزدوروں کو قوس و قزح کی طرح خوبصورت کپڑوں کے تانے بانے تیار کرتے دیکھا تھا ۔ وہ ہر روز

ہمیشہ اپنی ماں کو زندگی اور محنت، انسان کی قوت اور اس کی محبت کی کہانی سنایا کرتا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی درد بھری ہوتی تھی۔ اور اس کے جسم سے ہمیشہ لونگ، الائچی، زیرہ اور خطِ استوا کے گھنے جنگلوں میں کھلنے والے اجنبی پھولوں کی خوشبو آیا کرتی تھی۔ اس کی آواز میں بالی عورتوں کے حُسن کا سوز تھا۔ اور جب کبھی وہ کسی کی بے مہری و بیباکی کا ذکر کرتا تو اس کی آنکھوں میں انڈونیشیائی آتش فشاں پہاڑوں کا لاوا چمکنے لگتا۔ بڑھی ماں کا تیسرا بیٹا مشرقی جھکڑ واقعی سب بیٹوں سے اور سب بیٹوں کی طرح بالکل نرالا اور انوکھا تھا۔ آج تک کسی نے اسے لڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ آج تک اس نے اپنی ماں کو یہ موقع نہیں دیا تھا کہ وہ اسے کسی تھیلے میں بند کرے۔ لیکن ظاہر ہے کہ آج وہ بہت ہی خطرناک طور پر کسی سے لڑ جھگڑ کر اور شدید طور پر زخمی ہو کر اپنے گھر کے اندر آ رہا تھا۔

ماں نے چلاتے ہوئے کہا "تمھیں کیا ہوا ہے؟ تم تو کبھی کسی سے نہیں لڑتے تھے۔ آج تم بھی دوسرے بیٹوں کی سی حرکت کر بیٹھے۔ میں تو تمھیں بڑا عقل مند اور اپنا سب سے شریف بیٹا سمجھتی تھی۔"

مشرقی جھکڑ نے ہولے سے کراہتے ہوئے کہا "درد بہت ہو رہا ہے ماں۔ ایسا درد تو میں نے آج تک نہیں محسوس کیا تھا۔ بڑے بڑے دُکھ جھیلے ہیں میں نے۔ مگر ایسی تکلیف کبھی نہیں اُٹھائی تھی۔"

"کس نے تمہیں یہ تکلیف پہنچائی ہے!" شمالی جھکّڑ نے یکایک اپنی کرسی سے کھڑے ہو کر غصّے میں مُکّا تانتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم نہیں۔"

"کیسے معلوم نہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے" جنوبی جھکّڑ نے آگے بڑھ کر کہا۔

مشرقی جھکّڑ بولا۔ "یہ سب کچھ بڑے معمولی طریقے سے شروع ہوا۔ میں دریائے یانگ سی کے کنارے کسانوں کو چاول کے کھیت تیار کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر میں وہاں سے جاپان میں ایک چرواہے کی ہاہاہا کا نغمہ سننے لگا۔ پھر وہاں سے میں بحرالکاہل چلا گیا۔ میں نے جاپانی کشتیوں کے بادبان کھول دیئے۔ اور لہروں سے اٹھکھیلیاں کر کے مچھلیوں کو بلانے لگا۔ بڑی خوشگوار دھوپ تھی۔ سمندر اس قدر صاف اور دھیما تھا، اس کا رنگ اس قدر نتھرا نتھرا نیلگوں تھا کہ مجھے اس کی شفاف گہرائیاں جن میں نازک اندام مچھلیاں تیر رہی تھیں اور رنگا رنگ کے قول غالیچوں کی طرح بچھے ہوئے تھے دیکھ کر نیند آنے لگی۔ یکایک ایک زور کا دھماکہ ہوا۔ سمندر کا پانی سینکڑوں گز اوپر کو اچھلا۔ اور پھر سمندر میں اک گہرا بھنور بناتے ہوئے نیچے جا گرا۔ سبز ناریل، خوبصورت پھولوں اور سیاہ آنکھوں والی دوشیزاؤں سے سجا ہوا ایک چھوٹا سا جزیرہ جس کے ساحلوں سے محبت، مصروفیت اور محنت کی مہک آتی تھی یکایک میری آنکھوں کے سامنے اس بھنور میں

سما گیا۔ مجھے ابھی تک وہاں کے لوگوں کی چیخیں یاد ہیں۔"
مشرقی جھگڑو نے اپنا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور میز پہ جھک گیا۔
غار میں چند لمحوں تک بالکل سناٹا رہا۔ صرف دور سے آبشار کے گرنے کی صدا سُنائی دیتی رہی۔

چند لمحوں کے بعد اس نے میز پر سے اپنا سر اُٹھایا۔ اس کی ایک آنکھ سڑ چکی تھی۔ لیکن دوسری آنکھ میں ایک آنسو چھلک رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "دوسرے لمحے میں ایک بہت بڑا بادل گوبھی کے پھول کی طرح پھیلا ہوا فضائے بسیط میں چکر لگانے لگا۔ اس کا رنگ زرد، نارنجی اور اُودا تھا اور اس میں زہر ہی زہر بھرا تھا۔ یہ زہریلا دھواں میرا گلا گھونٹنے لگا۔ اور میں چیختے چلاتے ہوئے وہاں سے بھاگنے لگا۔ جاپان سے کوریا آتے ہوئے، کوریا سے فلپائن جاتے ہوئے، فلپائن سے سنگاپور جاتے ہوئے رستے میں آسٹریلیا کے ایک صحرا میں میں نے پھر یہی دھماکہ دیکھا۔ اُسی طرح کی چمک، اسی طرح کا دھواں، اسی طرح کی تباہی۔ یہ جو تم میری جگہ جگہ سے کھال ادھڑی ہوئی دیکھ رہے ہو، یہ انہیں دو دھماکوں کی وجہ سے ہے۔"

یکایک جنوبی جھگڑو اپنے مشرقی بھائی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اور اسے اپنے بازو اور رخسار کے آبلے دکھانے لگا۔

مشرقی جھکڑ نے حیرت سے کہا۔ "کیا وہاں بھی یہی دھماکہ ہو رہا ہے۔ تمہارے علاقے میں؟"

جنوبی جھکڑ نے افسوس سے سر ہلایا۔

بڑھی ماں حیرت اور پریشانی سے ڈول ہو کے بولی۔ "یہ دنیا کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟ اس سے پہلے بھی میرے بیٹوں نے آدمیوں کی جنگیں دیکھی تھیں۔ جب فضا میں لکڑی کے تیر سنسناتے تھے۔ جب لوہے کی گولیاں چیختی ہوئی کان کے پاس سے گذر جاتی تھیں۔ مگر وہ تو بہت معمولی سی آگ تھی۔ میرے بیٹوں کی کھال پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ یہ تو ___ یہ تو جانے کیسی آگ ہے۔ جو سینکڑوں میل تک سب کچھ جھلسا دیتی ہے"۔

"جب سے دنیا بنی ہے۔ اس وقت سے آج تک ہوا کے بیٹے کبھی زخمی نہیں ہوئے"۔ شمالی جھکڑ نے حیرت زدہ ہو کے کہا۔ "مگر اب کیا ___ کیا ہونے والا ہے"۔

"سب مر جائیں گے۔ ہوا کے سب بیٹے مر جائیں گے"۔

ہم سب نے گھوم کر دیکھا۔ یہ ہوا کا چوتھا بیٹا تھا مغربی جھکڑ۔ وہ دروازے پر کھڑا، ایک عمدہ سلے ہوئے سوٹ میں ملبوس اپنی ٹوپی ہاتھ میں اٹھائے ہم سب کو جھک کر سلام کر رہا تھا۔ وہ ان بیٹوں میں سب سے زیادہ نوجوان اور خوبصورت تھا۔ اس کی باتوں میں بڑی موہنی تھی۔ نگاہوں

میں نشے کی چمک، ہونٹ متبسم۔ پاؤں رقصاں۔ وہ ہولے ہولے ایک نئی دھن گنگناتا ہوا، غار کے فرش پر اپنے نئے جوتے نچاتا ہوا، رقص کی نئی گت پر ناچتا ہوا ہمارے قریب آیا۔ ہمارے قریب آ کر اس نے پتلون کی جیب سے چاندی کا ایک فلاسک نکلا۔ اور اسے اپنے منہ سے لگا کے غٹاغٹ پی گیا۔ پھر ایک خوشبودار رومال سے اس نے اپنا منہ پونچھا۔ اور ہماری طرف دیکھ کر ایک استہزائیہ انداز میں کہنے لگا۔

"سب مر جائیں گے۔ ہم سب مر جائیں گے۔ انسان نے مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ اس لڑائی میں ہم سب کو بھی مار کر خود ختم ہو جائیگا"۔

"تم کیا کہہ رہے ہو میرے بچے"۔ ماں بالکل ہراساں ہو کے بولی۔

"آج کیسی شام آئی ہے۔ میرا جو بیٹا آ رہا ہے، موت کا پیغام لے کے آ رہا ہے"۔

مغربی جھکڑ نے کہا "! میں جدھر سے آ رہا ہوں، وہاں شب و روز قلعے بندیاں ہو رہی ہیں۔ خندقیں کھودی جا رہی ہیں۔ زیر زمین اسلحہ بنانے کی فیکٹریاں کھل رہی ہیں۔ بمبار ہوائی جہازوں کے لئے اڈے تعمیر ہو رہے ہیں۔ کارخانے میں زہریلی گیسیں سلنڈروں میں بند کی جا رہی ہیں۔ اس دفعہ ساری انسانیت ایک دھماکے سے اپنے آپ کو اڑا دینے والی ہے۔ اس لئے پیئو، مرنے سے پہلے خوب پیئو، اور جی کھول کر رقص کرو"۔

مغربی جھکڑ نے پھر وہی چاندی کا فلاسک نکالا۔ اور اسے اپنے منھ سے لگا لیا۔

ماں نے کہا:۔ "اگر ہوا کے بیٹے مر گئے تو کون زندہ رہے گا؟"

مشرقی جھکڑ نے کہا۔ "ہم کھیتوں میں بیج بوتے ہیں۔ اور پھولوں میں خوشبو لاتے ہیں۔ ہم پہاڑوں پر جنگل اگاتے ہیں اور ترستے ہوئے میدانوں میں بارش برساتے ہیں۔ ہم خشک حدت میں خنک ہوا کا جھونکا بن کے آتے ہیں۔ اور منجمد سردی کو اپنے سانس کی آنچ سے پگھلا دیتے ہیں۔ بہار ہم سے ہے۔ اور انسان کا وجود ہم سے ہے۔ روٹی کا خمیر ہم سے ہے اور انگور کی شراب ہم سے ہے۔ اور جب کوئی کھڑکی کے نیچے کھڑے ہو کے اپنے محبوب کو وائیلن کا گیت سناتا ہے تو اس گیت کو بھی ہم ہی محبوب کے کانوں تک پہنچاتے ہیں۔ اس لئے نغمے کا وجود ہم سے ہے اور قوس قزح کے رنگ ہم سے ہیں۔ اور محبت ہم سے عبارت ہے۔ انسان ہم میں اس طرح رہتا ہے۔ جس طرح مچھلی پانی میں۔ اس لئے اگر انسان نے ہمیں بھی زہر دے کے مار ڈالا۔ تو وہ پھر خود کہاں بچے گا؟"

اب ہوا کے چاروں بیٹے دیکھ رہے تھے۔

ماں بولی۔ "ہم تو ہوا ہیں۔ تم تو انسان ہو۔ تم کیا کہتے ہو۔ اس مصیبت کا کیا علاج ہے؟"

کچھ علاج نہیں ہم سب مرجائیں گے۔ ہم سب مرجائیں گے۔ مغربی جھکڑ
نے اب کے نقشے میں ہنکار کر بولا۔
اس کی ماں نے غصّے سے اس کی طرف گھورا۔ اور بولی "۔ اگر اس کے
بعد بھی تم نے اپنی بکواس نہ بند کی، تو میں تمہیں تھیلے میں بند کر دوں گی"۔
مغربی جھکڑ نے اپنے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر ہشش، کہا —
ماں شفیق ماں۔ اب میں کچھ نہیں کہوں گا"۔
اب ہوا کے چاروں بیٹے پھر میری طرف دیکھ رہے تھے۔
میں اپنی کرسی پر بڑی پریشانی سے کسمسایا۔ آخر مجھے بولنا ہی پڑا۔
میں نے کہا "میں زیادہ تو کچھ نہیں جانتا۔ مگر بزرگوں سے سُنا تھا
کہ اس زمین اور آسمان کے بیچ میں کہیں پر جنّت ہے۔ اس کے اندر
ایک پیڑ ہے۔ یہ علم کا پیڑ ہے"۔
"وہی پیڑ نا جس کا پھل آدم نے کھایا تھا۔ اور جنّت سے نکالے
گئے تھے"؟
"ہاں"
"ارے" شمالی جھکڑ بڑی بے دلی سے بولا "تم باغِ ارم کی بات کہتے
ہو؟ وہاں تو میں ہر سو سال کے بعد اس دُنیا کی رپورٹ پیش کرنے جاتا
ہوں۔ کل پھر جانے والا ہوں"۔

میں نے کہا۔ "تو اگر تم مجھے وہاں لے چلو۔ تو شاید علم کے پیڑ سے اس کا کوئی علاج دریافت ہو سکے۔"

"تو گویا تم پھر شجرِ ممنوعہ کھانے پر آمادہ ہو؟" جنوبی جھکڑ نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی ہرج نہیں ہے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ انسان کی عظمت اسی میں پوشیدہ ہے۔"

"باؤلے ہوئے ہو۔ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "تم مجھے لے تو چلو۔ وہاں۔ باقی میں سب کہہ لوں گا۔"

شمالی جھکڑ نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ ماں نے آہستہ سے سر ہلایا کہنے لگی۔ "یہ اس کی زندگی اور موت کا سوال بھی تو ہے۔ تم اسے لے جاؤ۔"

دوسری صبح شمالی جھکڑ نے مجھے اپنے کندھے پر بٹھا لیا۔ اور دُور دُور میدانوں، صحراؤں، جنگلوں، پہاڑوں سے دُور اوپر پرواز کرتا رہا۔ یہاں سمندر، تالاب تھے۔ ندیاں چاندی کی لکیریں اور کھیت زمین کے رخسارہ کی طرح دمک رہے تھے۔ ہم لوگ ہزاروں میل اوپر ہی اوپر چلے جا رہے تھے۔

"کیا باغِ ارم آسمان پر ہے؟" میں نے شمالی جھکڑ سے پوچھا۔

"نہیں زمین کے اندر ہے۔ لیکن اس کا دروازہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ اس دروازے کے باہر ایک پرندہ ہمیشہ پہرہ دیتا رہتا ہے۔ اور اس پرندے کا ایک پر زندگی کا ہے، دوسرا موت کا۔ اس دروازے کے دو پٹ ہیں۔ ایک صبح کا، دوسرا رات۔ اس کے دروازے کی محراب آدھی برف کی بنی ہوئی ہے آدھی دھوپ کی، باغِ ارم کا دروازہ بڑا عجیب ہے۔ جب آدمی وہاں سے گذرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ موت کے منھ میں سے گذر رہا ہے اور زندگی کی طرف جارہا ہے۔

میں نے کہا۔" مجھے علم کا پیڑ دیکھنے کا بڑا اشتیاق ہے۔"

شمالی جھکڑ نے کہا۔ اس پیڑ میں بظاہر کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ ایک سیدھا سادا پیڑ ہے۔ بہت اونچا پیڑ ہے۔ اس کا رد پہلا تنا بہت پھسلواں ہے۔ پورے تنے پر کہیں کوئی شاخ نہیں ہے جس کا سہارا لے کر آدمی اوپر چڑھ سکے۔ بس آدمی کو اپنی ہمت اور کاوش کے سہارے پر اوپر چڑھنا پڑتا ہے۔ چوٹی کے بالکل اوپر جاکر اس درخت سے ایک شاخ پھوٹی ہے۔ اس شاخ کے آخر میں ایک پتہ، صرف ایک لرز رہا ہے۔ بس یہی شجر ممنوعہ ہے۔"

مجھے لے چلو!" فوراً وہاں لے چلو!"

"اب ہم اپنی منزل کے بہت قریب آرہے ہیں۔" اتنا کہہ کر شمالی جھکڑ نے

بادلوں میں غوطہ مارا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے چاروں طرف خوش آواز ارغنوں بج رہے ہیں۔ اور ہلکی ہلکی خوشبوئیں چاروں طرف پھیل رہی ہیں۔ اور عود اور عنبر کا دھواں چاروں طرف سے میرے احساسات کو گھیرتا چلا آرہا ہے۔ میری آنکھیں آپ ہی آپ بند ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب میری آنکھیں کھلیں تو میں نے اپنے آپ کو باغِ ارم میں پایا۔

یہاں جتنے پھول تھے، آنکھیں رکھتے تھے اور اپنی شاخوں سے تتلیوں کی طرح اڑ سکتے تھے۔ اس لیے اُنھیں شاخوں سے توڑنے کی ضرورت نہ تھی۔ یہاں جتنے جانور تھے درختوں سے پھلوں کی طرح لگے تھے۔ یہ مور کا درخت تھا۔ اس درخت کا ہر پتّہ مور کا پنکھ تھا۔ یہ بلبل کا پیڑ تھا۔ اس پیڑ کا ہر پھل بلبل کی طرح چہچہاتا تھا۔ یہ بندر کا درخت تھا۔ اس درخت کی ہر شاخ بندر نما تھی۔ اور اس جگہ سے اس جگہ تنے پر اُچکتی پھرتی تھی۔ ابھی آپ نے اس شاخ کو پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو یہ شاخ اچک کر دوسری شاخ سے اوپر جا لگی۔
باغ ارم میں ہر خوشبو کا الگ رنگ تھا۔ گو باغِ ارم کے پرند طرح طرح کی خوشبوئیں پہنتے تھے، پھر بھی ان کے جسم اندر سے اس طرح روشن تھے کہ ان کا ظاہر و باطن یکساں نظر آتا تھا۔

پریزادوں کی ملکہ میرے پاس آئی۔ بولی۔ "مجھے شمالی جھکڑ نے بتایا ہے تم علم کا پیڑ دیکھنا چاہتے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

پری بولی۔ "علم کا پیڑ دیکھنے کی ایک سزا ہے۔"

"کیا؟"

"تمھیں محبت چھوڑنا پڑے گی۔"

"چھوڑ دوں گا۔"

"اور نیند۔"

"چھوڑ دوں گا۔"

"تمھیں بھوکا رہنا پڑے گا۔"

"رہوں گا۔"

"علم کا پیڑ چڑھتے چڑھتے تمھارا لباس تار تار ہو جائے گا۔ تمھارے روئیں روئیں میں نوکیلے کانٹے چبھنے لگیں گے۔ تمھارے ہاتھوں اور تلووں سے خون بہنے لگے گا۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔"

"تمھارے لئے دن نہیں ہوگا اور رات نہیں ہوگی۔ تم نہ دھوپ میں ہی بیٹھوگے نہ چھاؤں میں۔ نہ برف پر۔ نہ چاندنی میں۔ اس کے بعد تمھارے

لئے کوئی نغمہ نہیں ہو گا۔"

"مجھے منظور ہے۔"

"تو آؤ میرے ساتھ۔"

علم کا پیڑ بہت اونچا تھا۔ میرے وہم و گمان سے بھی بہت اونچا۔ شفاف بادل اس کے وسط میں کہیں منڈلا رہے تھے۔ اور وہ ان سے بھی بہت اوپر گویا ستاروں سے باتیں کرتا ہوا بلند و بالا نظر آرہا تھا۔ چوٹی کے قریب ایک شاخ پھوٹ کر ایک بانہہ کی طرح جھول رہی تھی۔ اور اس شاخ کے آخری سرے پر ایک پتہ۔ پان کی شکل کا۔ یا آدمی کے دل کی شکل کا لرز رہا تھا۔

"یہی شجرِ ممنوعہ ہے؟"

"ہاں"۔ پری بولی۔ "اور اسی پتے پر تمہارے سوال کا جواب لکھا ہے۔"

شمالی جھکڑ نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "ہوائیں مر جائیں گی اگر تم اس سوال کا جواب نہ لاؤ گے۔"

علم کے پیڑ پر چڑھنا بہت مشکل تھا۔ دو قدم اوپر چڑھتا تھا تو ایک قدم نیچے پھسل آتا تھا۔ راستے میں بڑی بڑی دشواریاں آئیں۔ سب سے پہلے

تو محبت آئی، وہ جو میری آنکھوں کی روشنی تھی اور میری روح کا تبسم تھی، وہ جس سے زندگی عبارت تھی اور حیات زمزمہ ریز۔ اس پیڑ پر چڑھتے چڑھتے آدمی کو اپنے سارے آنسو جھٹک دینے پڑتے ہیں۔ یہاں کوئی لباس نہیں رہتا۔ اور کوئی تبسم نہیں رہتا۔ اور کوئی خواہش نہیں رہتی۔ سوائے ایک کے۔

اس کے بعد چاروں موسم آتے ہیں۔ بہار کے پھول اپنے پاس بلاتے ہیں۔ گرمی اک تیز پیاس کی طرح جسم کے روئیں روئیں میں گھس کر خنجر کی طرح وار کرتی ہے۔ آخر میں سردی آتی ہے اور ہڈیوں کو منجمد کرنے لگتی ہے۔ احساسات برفیلے بھالوں کی طرح دل پہ شبخوں مارتے ہیں۔ جب چاروں موسم گزر جاتے ہیں تو شہرت کی خوشبوئیں آتی ہیں اور اپنے پاس بلاتی ہیں۔

"ہوائیں مرجائیں گی۔ ہوائیں مرجائیں گی"

نیچے سے شمالی جھکڑ چلایا۔

جب آدمی شہرت کی خوشبو کی پرواہ نہیں کرتا تو طرح طرح کے خیالات آتے ہیں۔ اس کا کوئی فائدہ بھی ہے؟ اس قربانی کا کوئی مقصد بھی ہے۔ اس سے کیا حاصل ہوگا۔ عمر عزیز کو گنوانے سے کیا حاصل؟ کانوں میں طرح طرح کے سنگیت بجنے لگتے ہیں۔ کتنے ہی پاؤں کی چھاگل۔ کتنی ہی نگاہوں کی نرمیاں۔ کتنی ہی تجوریوں کے خزانے اپنے موتی بکھیر کر اپنی طرف بلانے لگتے ہیں۔ مگر آدمی اوپر ہی اوپر چڑھتا چلا جاتا ہے۔

"ہوائیں مر جائیں گی۔ ہوائیں مر جائیں گی۔"
شمالی جھکّڑ پھر مجھے یاد دلاتے ہوئے چلاّیا۔
چڑھتے چڑھتے جب کوئی بن آتا، تو سخت ویرانی اور سناٹا آتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی مددگار نہیں۔ کوئی دوست نہیں۔ کوئی ساتھ میں سانس لینے والا نہیں۔ تم اکیلے بالکل اکیلے ہو۔ جب آدمی اس احساس سے بھی گذر جاتا ہے تو پھر بڑھاپا آجاتا ہے۔ قوا شل ہونے لگتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں جواب دینے لگتے ہیں۔ اب آگے نہیں، آگے نہیں چلا جائے گا۔ صرف ایک گز پر چوٹی ہے۔ چھوڑ دو آرام کرو۔ چھوڑ دو آرام کرو۔ صرف ایک فٹ پر چوٹی ہے۔ چھوڑ دو آرام کرو۔ چھوڑ دو آرام کرو۔ آنکھیں بند کر لو۔ اور دو پہلے تنے سے نیچے کھسکتے چلے آؤ۔ نیچے پھسلنے میں کتنا مزا ہے۔
میں نے ہاتھ بڑھا کر لرزتی ہوئی انگلیوں سے شاخ کا پتہ توڑ لیا۔
عین اسی وقت علم کا پیڑ میرے ساتھ گرتے گرتے زمین میں دھنس گیا۔
یکایک مجھے معلوم ہوا کہ میں اسی غار میں ہوں۔ میرے ہاتھ میں انسان کے دل کی شکل کا ایک پتہ ہے۔ اور اس پر صرف ایک لفظ لکھا ہوا ہے "امن"
"امن!" میں نے ناامیدی سے اس لفظ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اس ایک لفظ سے کیا ہوگا؟"
"مجھے دکھاؤ۔" میرے کانوں میں ایک شیریں آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔

باغ ارم کی پری میرے قریب کھڑی تھی۔ میں نے پتہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ پری نے اس پتے پر اپنے دستخط کئے اور مجھ سے کہنے لگی۔ "اب اس پتے کو تم ساری دنیا میں لے جاؤ۔ اور گھوم گھوم کر لوگوں کے دستخط کراؤ۔"

"مگر ان دستخطوں سے کیا ہوگا؟" میں نے پھر اسی مایوسی کے عالم میں پوچھا۔

پری نے مسکرا کر کہا "جب حرف سے حرف جُڑتا ہے تو شیکسپیر پیدا ہوتا ہے۔ جب اینٹ سے اینٹ جڑتی ہے۔ تو تاج محل بنتا ہے۔ جب دستخط سے دستخط جڑیں گے تو وہ زنجیر پیدا ہوگی جس میں دنیا کے سارے جنگباز بندھ جائیں گے"

یکایک میری سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ میں نے امن کے پتے کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور آہستہ آہستہ غار سے باہر نکل آیا۔ غار کے باہر اب طوفان تھم چکا تھا۔ اور چاروں طرف خوشگوار دھوپ کھلی ہوئی تھی۔

دور دور تک وادیوں میں امن کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

محبت کا پھول

شیام کے مرنے سے دو سال پہلے میری اس کی لڑائی ہوئی تھی۔ یونہی ایک ذرا سی بات پر۔ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو میں لڑتا بھی نہیں۔ مگر شیام میرے اس قدر قریب آچکا تھا کہ مجھے لڑنا پڑا۔ لڑائی کی ابتدا، بھی اس کی طرف سے نہیں ہوئی۔ گو میرے خیال میں وہی اس کی وجہ تھا۔ مگر اس دو سال کے عرصے میں میں نے کبھی اس سے صلح کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ اس نے بہتیری بار کی۔ اس نے میرے بھائی سے کہا۔ میرے بھائی کی بیوی سے کہا۔ خود مجھے بلانے کی کوشش کی۔ ایک بار وہ مجھے ہربنس اپنے چھوٹے بھائی اور اپنے چچا کے ساتھ فلورا فونٹین کے قریب مل گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔ اس کا چھوٹا بھائی اور چچا بھی مجھے دیکھ کر مسکرائے۔ کیونکہ وہ مجھے بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ شیام نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے اور آگے بڑھتے ہوئے ہنستے ہوئے میرا استقبال کرنا چاہا۔ یکایک میں نے پلٹا کھایا اور گھوم کر تیزی سے مخالف سمت کو مڑ گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر اسکی

طرف دیکھا بھی نہیں ۔

آخری بار میں نے اسے پدوکن اور چوکو سیوف کے اعزازی جلسے میں دیکھا، جو ان دو مشہور و معروف سوویٹ فلمی فن کاروں کے اعزاز میں ایکسلیسر سنیما میں منعقد کیا گیا تھا۔ اس میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی تشریف لائے تھے۔ عباس اور میں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ اتنے میں شیام کو دیکھ کر عباس نے اسے ادھر ہی بلا لیا۔ میرے قریب ایک سیٹ خالی تھی۔ وہ آیا۔ لمبا تڑنگا چھ فٹ کے قریب اونچا۔ فراخ ماتھا، مضبوط ٹھوڑی۔ ہونٹوں پر بشاش مسکراہٹ، آنکھوں میں ذہانت کی لَو۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میرے قریب آیا اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "ہیلو بھاپا۔"

چونکہ میں اس سے عمر میں چھ سال بڑا تھا۔ اس لئے وہ مجھے بھاپا یعنی بڑا بھائی کہا کرتا تھا۔ حالانکہ مجھ سے بڑی عمر والے بھی آج کل مجھے بھاپا کہتے رہتے ہیں۔ مگر اس میں اس کا کیا قصور۔ بعض آدمیوں کے ماتھے پر ہی بھاپا جی لکھا ہوتا ہے۔

بھاپا جی نے یعنی میں نے اس موقع پر بھی اس کی گرم جوشی کا استقبال بڑی سرد مہری سے کیا۔ میں نے زیر لب ہی اسے آہستہ سے ہیلو کہا اور پھر سامنے سٹیج پر دیکھنے لگا۔ اس روز وہ ڈھائی گھنٹے میرے ساتھ بیٹھا رہا۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر نہ کر سکا۔ وہ بھی بے چین اور

دل برداشتہ تھا۔ مگر خاموش تھا۔ دونوں دوست ساتھ ساتھ رہے۔ مگر خاموش رہے۔ یہ عجیب سی دوستی تھی جو قہقہوں سے شروع ہوئی اور خاموشی میں کھو گئی۔ کیونکہ اس کے بعد میں نے شیام کو کبھی نہیں دیکھا۔ مرنے سے چند روز پہلے اس نے مہندر ناتھ کو بلوا بھیجا۔ "مجھے تم سے ضروری کام ہے۔" مگر مہندر بھی چند مصروفیات کی وجہ سے اس سے ملنے نہ جا سکا۔ وہ کیا ضروری کام تھا۔ کیا وہ ہمارے بگڑے ہوئے تعلقات کے متعلق تھا؟ دل میں ہزاروں طرح کے وسوسے آتے ہیں۔ ہزاروں خیال آتے ہیں۔ مگر اب اس کا کوئی مداوا نہیں ہے۔ وہ دیوار پھاند کر دوسری طرف چلا گیا ہے۔ آج میں اسے آواز دیتا ہوں، اسے پھر محبت اور پیار سے اپنے گلے سے لگانا چاہتا ہوں۔ مگر وہ دیوار کے دوسری طرف چلا گیا ہے۔

شیام کو فلمی دنیا میں دلچسپی لینے والے لاکھوں لوگ بطور ایک ہیرو کے جانتے ہیں۔ مگر بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ وہ اپنی نجی زندگی میں بھی ایک ہیرو کی طرح رہتا تھا۔ سکرین پر اور سکرین کے باہر بھی اس کی الگ ہی شان تھی۔ ایک اپنی شخصیت تھی جس کا اثر وہ ہمیشہ اپنے سے بہتر اذہان اور شخصیتوں پر بھی چھوڑ جاتا تھا۔ کھلا خرچ کرنے۔ صاف ستھرے اور خوبصورت کپڑے پہننے۔ اچھا کھانا کھانے۔ اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے اور زور سے قہقہہ لگانے کی عادتیں اس کی شخصیت کا پُرکشش

حصہ تھیں۔ اس کی گفتگو میں اس کی فطری ذہانت کو بڑا دخل تھا۔ فلمی دنیا کے ناصاف ماحول میں رہتے ہوئے بھی اس کی شخصیت ایک دھلے ہوئے کپڑے کی طرح چمکتی ہوئی نظر آتی تھی۔

اس کی فلمی زندگی کا آغاز اچھا نہیں تھا۔ شروع شروع میں وہ اچھا ایکٹر بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسے اپنے آپ کو بنانے سنوارنے اور آگے بڑھانے میں بڑی محنت کرنی پڑی۔ وہ فلمی دنیا میں کسی سہارے یا وسیلے کے بغیر آیا تھا۔ وہ جب تک جیا کسی سہارے یا وسیلے کے بغیر جیا۔ خوشامد اس کی فطرت کا حصہ نہ تھی۔ شیام خطرناک حد تک صاف گو تھا۔ جو اس کے جی میں آتا صاف صاف منہ پر کہہ دیتا تھا۔ اور وہ اس معاملے میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا بھی لحاظ نہ کرتا۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ منہ پھٹ یا گستاخ تھا۔ یا وہ اپنے سے بڑوں کا ادب نہ کرتا تھا۔ مگر وہ بے جا خوشامد کا قائل نہ تھا۔ اور نہ اسے سازشوں اور ایک دوسرے کے خلاف چالاکیوں کے جال بننے میں مزا آتا تھا۔ ادب و احترام کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اگر اسے کوئی بات ناپسند ہوتی تو وہ اپنے سے بڑوں کی محفل میں بھی اس کا ذکر کرنے سے گریز نہ کرتا۔ مثال کے طور پر جوش صاحب کا وہ بیحد عقیدت مند اور پرستار تھا۔ لیکن اگر کسی ادبی، ذہنی یا فلمی معاملے پر ان سے بحث ہو جاتی تو شیام ہر بات پر ہاں میں ہاں ملانے سے انکار

کر دیتا اور جس بات کو غلط سمجھتا اس کی تردید بڑے زور سے کرتا۔
ہر جگہ زندگی کے ہر شعبہ میں وہ اس صاف گوئی کا قائل تھا۔ محبت کے میدان میں کم از کم تین بار اسے اپنی اسی صاف گوئی کی وجہ سے بیحد تکلیف اٹھانا پڑی۔ ہر موقع پر اس نے غم کھا لیا اور اپنی محبت کو ناکارہ ورق کی طرح پھاڑ کر پھینک دیا۔ مگر اپنی صاف گوئی کو ترک نہیں کیا۔ اپنی زخمی محبت کو قہقہوں کی تابناک تہوں میں چھپا لیا تاکہ کسی کو گمان نہ ہو کہ اس ہنسی کے پیچھے کتنے آنسو چھپے ہوئے ہیں۔ مگر اپنی صاف گوئی کو ترک نہیں کیا۔ صاف گوئی سے جب کسی دوسرے کو تکلیف پہنچے تو وہ آسان ہوتی ہے۔ مگر صاف گوئی سے جب خود کو تکلیف پہنچے تو وہ بہت مشکل ہوتی ہے۔ شیام اس میدان کا بھی ہیرو تھا۔

شیام کو دوست بنانے کا فن آتا تھا۔ دراصل وہ جس روز ایک نیا دوست نہ بنا لیتا اسے چین نہ آتا تھا۔ زندگی سے محبت اس کی نس نس میں سمائی ہوئی تھی۔ اسی محبت سے وہ ہمیشہ بیقرار اور بے چین رہا کرتا تھا۔ بھاگنے دوڑنے ناچنے کودنے ہاتھ پاؤں ہلانے اور زور زور سے باتیں کرنے کا اسے بیحد شوق تھا۔ اور کچھ نہیں ہوگا تو وہ راہ چلتے ہوئے لوگوں سے باتیں کرنا شروع کر دے گا۔ باتیں کرتے کرتے اس کے گھر چلا جائے گا۔ دوسرے دن انھیں اپنے گھر بلائے گا۔ اور وہ لوگ بہت

جلد اس کے ماں باپ بہن بھائی، اچھا دوست یار اور محبوب ہو جائیں گے۔
شیام کی اپنی چھوٹی سی تیس سالہ زندگی میں بہت سے دوست تھے۔ بہت سے
سگے بھائی تھے۔ بہت سے چچا تھے۔ بہت سی موسیاں اور خالائیں تھیں۔
اور بڑی چھوٹی بہنیں اور مائیں تھیں۔ بہت سی محبوبائیں تھیں۔ وہ ایک
بڑے وسیع انداز میں بڑی بھرپور زندگی بسر کرنے کا عادی تھا۔ اس نے
اپنی چھوٹی سی زندگی کو بڑی محنت سے محبت کی بھوک مٹانے کے لئے بہت دور تک
پھیلا دیا تھا۔ ملٹری کے جوان اور فرانسیسی سپاہی اینگلو انڈین تحبائیں جوتشی
قلفی والے، کتھا واچک، کپڑا بیچنے والے چینی، حمال، ڈاکٹر، ادیب، قلم ساز
ریس کے جاکی، ریلوے کے کلرک، بیکار، گداگر، ٹھیکے والے، کھلاڑی،
دانش ور اور بیوقوف۔ اس کی دوستی کی ہمہ گیریوں نے دُور دُور تک
اپنا اثر پھیلا رکھا تھا۔ اسی لئے جب آج وہ مر گیا ہے تو دُور دُور
تک اس کی باتوں کی خوشبو باقی ہے۔

میری اور اس کی ملاقات بہت معمولی طریقے سے ہوئی۔ مگر اس
میں بھی اس کی شخصیت کا راز جھلکتا ہے۔ میں جب آل انڈیا ریڈیو چھوڑ
کر پونہ کی شالیمار پکچرز میں آیا تو جوشؔ اور ساغرؔ وہاں پہلے ہی موجود تھے۔
میں ان کے کمرے میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا تو شیام جو اس کمپنی کا ہیرو تھا
چپکے سے اندر داخل ہوا۔ میرے قریب کرسی پر بیٹھ کر مصافحے کے لئے

ہاتھ بڑھا کے بولا۔ میرا نام شیام ہے۔ میں آپ کو پہچانتا ہوں۔ میں نے آپ کی فلاں کتاب پڑھی ہے۔ فلاں نہیں پڑھی۔ فلاں کہانی مجھے بہت پسند آئی۔ فلاں پسند نہیں آئی۔ بہرحال کیا آپ کا آج شام کا سینما اور رات کا کھانا میرے ساتھ ہو سکتا ہے؟ یہ سب کچھ وہ ایک سانس میں کہہ گیا۔ اور اس کے بعد ہنسنے لگا۔ پھر ہم سب ہنسنے لگے۔ بہت جلد اس نے مجھے اپنا بے تکلف دوست بنا لیا۔ پھر تو ہم اکٹھے رہنے لگے۔ دو سال سے زیادہ عرصہ تک ہم لوگ ایک مکان میں اکٹھے رہے۔ حالانکہ شیام بے حد انفرادیت پسند تھا، خود پرستی بھی اس میں تھی، مگر دوست سے دوستی اور ذہانت سے سمجھنے کی سیکھنے کی خو بھی اس میں تھی۔ چنانچہ جب اس نے دیکھا کہ میں چلنے کا عادی ہوں اور وہ سائیکل پر گھومنا پسند کرتا ہے تو اس نے میرے لئے سائیکل پر چڑھنا چھوڑ دیا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں ایک قمیض اور پتلون میں گھومنا پسند کرتا ہوں تو وہ بھی کوٹ اتار کے کھلے کالروں والی قمیص میں گھومنے لگا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں رات کو کتابیں پڑھتا ہوں اور وہ روز رات کو سینما دیکھتا ہے تو اس نے ہر روز سینما جانا بند کر دیا۔ اب اکثر یوں ہوتا تھا کہ ادھر میں اپنے کمرے میں بند کوئی کتاب پڑھ رہا ہوں تو وہ بھی اپنے کمرے میں بند ہو کے کتاب پڑھ رہا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا کتابیں پڑھنے کا شوق

اس کی زندگی کا حصہ بن گیا۔ ترقی پسند ادب چاہے، وہ دنیا کے کسی کونے کا کیوں نہ ہو وہ ڈھونڈ کے لاتا تھا۔ اور چاہے کچھ بھی ہو وہ خود کتاب خرید کے پڑھتا تھا اور کبھی دوسرے کو اپنی کتاب پڑھنے کو نہیں دیتا تھا۔ بلکہ ہمیشہ یہ مطالبہ کرتا تھا کہ کتاب خود خرید کے پڑھو۔ ان دنوں اس کی آمدنی بھی زیادہ نہ تھی۔ پھر بھی گھر اپنی ماں کو روپے بھیجنے کے بعد، اور مکان کا کرایہ، راشن کا خرچ ادا کرنے کے بعد وہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ کتابوں پر صرف کرتا تھا۔ انہی دنوں اسے اردو کے بہترین شاعروں اور ادیبوں سے ملنے کے مواقع ملے۔ اور وہ ذاتی طور پر بھی ان ادیبوں کے بہت قریب ہو گیا۔ اور ان کی تحریک میں اور ان کے مقاصد میں گہری دلچسپی کا اظہار کرنے لگا۔

پونا کی زندگی کی بہت سی باتیں آج یاد آتی ہیں۔ پرویز کی آمد پر پرمنگتی کا ہیرو نوکری کی تلاش میں پونا آیا تھا۔ اور گو شالیمار میں خود شیام ہیرو تھا، مگر شیام نے بڑی فراخ دلی سے خود اس کی سفارش کی۔ اور کمپنی کے مالک سے کہہ سن کے اسے اپنی کمپنی میں ایک دوسرا ہیرو رکھوا دیا۔ پھر پرویز بھی ہمارے ساتھ رہنے لگا۔ بعد میں مہندر بھی آ گیا۔ پرویز، شیام اور مہندر یہ تینوں وجیہہ لوگ تھے چنانچہ ہمارے گھر اکثر لڑکیوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ بہت سی لڑکیاں ان میں سے کسی ایک

نہ ایک پہ مرتی تھیں۔ اور میں ان سب کو دیکھ کے جلتا تھا۔ بڑی رونق تھی۔ مگر بے ہودگی نہ تھی، کیونکہ پورے گھر کی فضا ادبی تھی۔ فلمی کم تھی ادبی زیادہ تھی۔ اس لیے جوانی کا کوتاہیوں خامیوں کے باوجود بھی توازن برقرار رہتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن جوش، ساغر، شیام پرویز، ہندر، اور میں اور دوسرے مقامی ادب پسند دوست مل بیٹھتے اور ایک چھوٹی موٹی ادبی مجلس منعقد کر لیتے۔ کبھی کبھی بمبئی سے یا یوپی سے یا پنجاب سے دوسرے ادیب آجاتے تو ہفتوں اپنے یہاں رہتے۔ ان سب باتوں نے شیام کی فکری زندگی پر بڑا خوشگوار اثر چھوڑا تھا۔ اور اس کے کردار کو نمایاں طور پر آگے بڑھنے کا موقع دیا تھا۔

مون سون کے بارشوں کے بہت سے دھندلے دھندلے دن یاد آتے ہیں۔ جب ہم لوگ سینما سے نکل کر اپنے گھر تک اکثر پیدل چلا کرتے تھے۔ تین چار لڑکے، تین چار لڑکیاں، بارش کی ہلکی ہلکی پھوار، چمکتی ہوئی آنکھوں میں بھیگی بھیگی نمی، بھیگی ہوئی سڑک پہ بھیگے ہوئے قدموں کی چاپ، گیلے ہاتھوں میں گیلے ہاتھ اور بھیگی ہوئی گرمی کا احساس، اور ایک بارش سے دھلے ہوئے جذبے سے مصفیٰ جذبے کی مسرت اور وہ گیت جو ہم سب لوگ چلتے چلتے گاتے تھے۔ اور جن میں شیام کی آواز سب سے اونچی اور سب سے بے سُری ہوتی تھی۔ میری عینک بار بار پانی کے

قطروں سے دھوئی جاتی اور میں بار بار اسے رومال سے صاف کرتا یا کسی کی ساری کے پلّو سے۔ اور "ک" کی زلف رخسار سے چپک کر عجیب سی خوبصورتی پیدا کرتی۔ اور "پ" کے گھنگھریالے بالوں پر پھوار کے قطرے یوں چمکنے لگتے جیسے اس نے باریک موتیوں کا جال اپنے بالوں میں ٹکا رکھا ہے۔ اور "ج" شوخی سے اونچے لانبے شیام کے سر کی طرف نگاہ اُٹھا کے کہتی۔ "اب تو تمھارے سر پہ برف جم رہی ہے شیام"۔ اور شیام ایک قہقہہ لگا کے اس کا چھوٹا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے کہتا۔ "لو دیکھو میری ننھی منھی چُوچی مُوچی گڑیا۔ برف ابھی پگھل جائے گی۔ گرما میٹر میرے ہاتھ میں ہے"۔

اور وہ رات جب میں اپنی والدہ کی علالت کی وجہ سے سخت پریشان تھا، شیام نے باتوں باتوں میں اپنی ماں کا ذکر کیا۔ جب بالکل بچپن ہی میں اس کی ماں اور باپ دونوں داغِ مفارقت دے گئے۔ اس کی سوتیلی ماں نے اسے پالا پوسا۔ اسے اپنی شفقت اور محبت دی۔ مگر اس سے شیام کی تسلی نہ ہوئی۔ ہزاروں دوستوں میں گھرے رہنے کے باوجود اس کی پیاسی روح کی تسلّی نہ ہوئی۔

اس نے مجھ سے کہا۔ "مجھے اپنی ماں کی صورت بھی یاد نہیں ہے میں اس کے دودھ کا بھوکا ہوں۔ میری سوتیلی ماں نے مجھے ماں سے

بڑھ کر چاہا۔ پھر بھی میں بھوکا ہوں بہت سے دوستوں نے مجھے اپنی دوستی اور محبت دی ہے۔ پھر بھی میں محبت کا بھوکا ہوں...... ننگا ہوں۔ پیاسا ہوں۔ اس دودھ کا نعم البدل مجھے کہیں نہیں ملا۔ شارک سکن میں نہ شراب میں، نہ محبوب کے بوسے میں۔ میری یہ تشنگی کبھی نہیں بجھی۔ میں اس قدر بھوکا کیوں ہوں......؟"

میں نے کہا "ہم جس وقفے میں پیدا ہوئے وہ دو تہذیبوں کے درمیان کا بحرانی دور ہے۔ ایک تہذیب مر رہی ہے دوسری جنم لے رہی ہے یہ بیچ کا وقفہ بھوک کا وقفہ ہے۔ محبت کی بھوک، روٹی کی بھوک، انسانیت کی بھوک، پیار اور آرام اور خدمت کی بھوک...... یہ تشنگی اس وقفے میں مٹائی نہیں جا سکتی۔ ہاں اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔"

اور شیام جب تک جیا اس نے اس سے مفید سماجی کام لیا۔ اس نے حتی المقدور اپنے سوتیلے بھائی بہنوں اور ماں کی خدمت کی۔ اور آخری دم تک خدمت کرتا رہا۔ اس نے سماج کے رواج توڑ دیئے۔ اور جس مسلمان لڑکی سے محبت کرتا تھا اس سے شادی کی۔ اس نے گذشتہ تین چار سال میں ترقی پسند ادب تحریک کی ہر ممکن مدد کی۔ امن کی اپیل پر دستخط کئے۔ اور اس کی دوسری بمبئی کنونشن کے لئے چندہ بھی دیا۔ بمبئی میں ہر اچھے مقصد کے لئے وہ اپنی مدد کرنے کے

لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ اور یہ مدد وہ منہ بنا کے سنجیدہ ڈھنگ سے نہیں کرتا تھا، بلکہ ہنستے ہوئے، مذاق کرتے ہوئے باتوں باتوں میں اس طرح مدد کر جاتا تھا کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ اسے واقعی زندگی کے بلند مقاصد سے اس قدر پیار ہے۔

"من کی جیت" نے شیام کو فلم کا مشہور ستارہ بنا دیا۔ جس نے ان کی شہرت اور دولت میں ترقی دی۔ اب وہ پہلی صف کا فلمی اداکار بن گیا۔ مگر اب بھی وہ پہلا شیام ہی رہا۔ بیباک، نڈر، بے خوف، صاف گو، محبت کا بھوکا۔ اپنی دو سال کی بچی کے بارے میں وہ اپنی بیوی تاجی سے روز کہا کرتا تھا۔

"میں اسے فلمی سٹار نہیں بناؤں گا۔ اسے میں چھ زبانوں، آٹھ زبانوں، دس زبانوں، دنیا کی سب سے بڑی زبانوں کا عالم بناؤں گا لوگ کہتے ہیں کہ بیٹے کو پڑھانا چاہیئے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ میری یہ بیٹی ہی میرا بیٹا ہے۔ اسے میں پیرس کے تصویر گھروں میں بھیجوں گا۔ روسی بیلے کی تعلیم دلواؤں گا۔ میری بیٹی دنیا کی بہترین کتابیں پڑھے گی۔ خود لکھے گی بھی۔ وہ ایک بہت بڑی دانشور ہو گی۔ کیوں تاجی!"

اور تاجی مسکرا کے کہتی۔ "ہاں شیام تمھارے خواب ضرور پورے ہوں گے۔"

شیام کہتا۔ "جو کام میں نہیں کر سکا وہ یہ کرے گی۔ جس کی بھوک مجھے ہے اس کی سیرابی میرے بچّوں کو میسّر ہوگی۔

جو دُنیا میں نے نہیں دیکھی وہ یہ دیکھے گی۔"

محبّت کا بُھوکا!

پرسوں محبّت کا بھوکا اچانک مر گیا۔ وہ بالکل تندرست اور صحت مند تھا۔ اس کے رخسار گلاب تھے۔ اس کی ہنسی جوان تھی۔ اس کا قہقہہ بلند تھا۔ اس کے بازوؤں میں قوّت اور دل میں زندگی کی محبّت تھی۔ صبح سویرے ہی اس نے اپنی ماں کو موٹر میں بٹھا کے پونا بھیجا۔ اپنی بہن سے جس کی شادی ہونے والی تھی مذاق کرتا رہا۔ پھر اس نے اپنی بچّی کو گود میں اُٹھا کر پیار کیا۔ پھر تاجی کا ہاتھ پکڑ کے کہا، "آج شام کو سنیما چلیں گے۔ میں سٹوڈیو سے ٹھیک چھ بجے واپس آجاؤں گا۔"

اس کے بعد وہ "شبستان" کی شوٹنگ میں چلا گیا۔

آؤٹ ڈور شوٹنگ پر گھوڑ سواروں کا سین تھا۔ وہ گھوڑے پر چڑھ کر ہنسی مذاق کرتا رہا۔ اپنے گھوڑے کو تھپتھپاتا رہا۔ گھوڑے سدھانے والے سے مذاق کرتا رہا۔ فلم کے سین کے لئے سرپٹ گھوڑا دوڑاتا رہا۔ یکایک گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے اس کی رکاب ٹوٹ گئی۔ اور شیام ایک جھٹکے سے زمین پر آرہا۔ اور گھوڑے کی تیز دولتّی اس

کے سر پر لگی۔ اور اس کی ناک اور منھ سے خون جاری ہوگیا۔ اسی وقت اس بے ہوشی کے عالم میں اسے برٹی سینما کے پاس ایک نرسنگ ہوم میں بھیجا گیا۔ ڈاکٹروں نے کہا۔"حادثہ خطرناک ہے۔ اس سے موت واقع ہو سکتی ہے"۔

مگر شیام نے ڈاکٹروں کو تسلی دی۔"گھبراؤ نہیں۔ میں لڑنا جانتا ہوں میں بچ جاؤں گا۔ کوئی فکر نہ کرو۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ خون شون کا بہنا سب بند ہو جائے گا۔ سمجھے ڈاکٹر صاحب"۔

ڈاکٹر مسکرایا۔

شیام لڑتا رہا۔

شام کے پانچ بجے اس پر جانکنی کی حالت طاری ہوگئی۔

چھ بجے کے قریب جبکہ اسے اپنی بیوی سے سینما جانے کے لئے ملنا تھا، چھ بجے کے قریب اسے ذرا سا ہوش آیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور ایک زور کی چیخ ماری اور دم توڑ دیا۔

محبّت کا بھوکا مر گیا۔

سُونا پوری کے شمشان گھاٹ پر میں نے اسے آخری بار دیکھا۔ اور اس سے کہا۔ اُٹھ بے بھوتنی کے سالے۔ تیرا دوست تجھے بلانے آیا ہے۔ رُوٹھا ہوا جگری دوست۔ خود تجھے گلے لگانے آیا ہے۔

آ پُرانی رنجشوں اور شکایتوں کو خیر باد کہہ دیں۔ اور ہاتھ میں ہاتھ لیکر دھندلی دھندلی بارشوں، ہلکی ہلکی چاندنی میں بھیگی بھیگی سڑکوں پر آوارہ پھریں۔ اُٹھ۔ اوبے سُرے گانے والے۔ بے ہنگم مونٹ ایورسٹ کے چچا شیام، آج تیرے ہونٹوں کی ہلکی سی جنبش پر میں سہگل کی ساری میٹھی دھنوں کو قربان کردوں گا۔ اُٹھ میری روٹھی جوانی کے روٹھے دوست۔ آج تیرے لئے سارے جہان کی محبتّوں کے خزانے لایا ہوں۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم اور تم کبھی ایک دوسرے سے روٹھیں گے نہیں۔ بلکہ دونوں مل جل کر دوسرے دوستوں کے ساتھ اس جہانِ نو کی تخلیق کریں گے، جہاں کوئی محبت بھوکی نہیں رہے گی۔ کوئی لَے بے سُری نہیں رہے گی۔

مگر آج شیام مجھ سے نہیں بولا۔ وہ آج مجھ سے کنی کاٹ گیا تھا اور مخالف سمت پر چپ چاپ خاموش اپنی بھوکی محبّت کے زخموں کو چھپا کے چلا گیا۔

دھند اور آگ اور شعلے لپکتے ہوئے......

جو مر جاتے ہیں وہ مر جاتے ہیں، پھر واپس نہیں آتے۔ پھر کبھی نہیں ملتے۔ پھر کبھی نہیں سُنتے۔ پھر کبھی نہیں ہنستے۔ لیکن جو زندہ ہیں وہ ہنس سکتے ہیں۔ اس لئے آؤ اپنے سارے روٹھے ہوئے

دوستوں کو منالیں۔ گذر جانے والے شیام کی یاد میں زندہ رہنے والے شیاموں کو گلے سے لگائیں۔

آج محبّت بھوکی ہے اور ایک سال کی بچّی رو رہی ہے۔

محبّت کی خاطر، بچوں کی خاطر۔ شیام کی ہنسی کی خاطر۔

زندگی کو آواز دو۔ اور اپنے آنسوؤں کو جھٹک دو، کیونکہ شیام نے ہمیں رونا نہیں ہنسنا سکھایا ہے۔

کالا سورج

میدانوں سے پرے بہت دُور اونچے پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک وادی تھی۔ اس وادی کے بیچ میں ایک چھوٹی سی خوشنما جھیل تھی، جس میں ایک پتلی سی آہستہ خرام ندی مشرقی پہاڑوں سے نکل کر آملتی تھی اور جھیل کے دوسرے کنارے سے پھُوٹ کر مغربی سلسلہ ہائے کوہ کی طرف چلی جاتی تھی۔

اس وادی تک پہنچنے کا راستہ بہت دشوار گذار تھا۔ چاروں طرف اتنے اونچے پہاڑ تھے کہ گرمیوں کے دنوں میں بھی ان کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی تھیں۔ شمال، مشرق، جنوب، تینوں طرف سے وادی کے اندر پہنچنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ صرف مغربی سلسلہ ہائے کوہ میں جدھر سے ندی گذرتی تھی، ایک چھوٹا سا درّہ تھا۔ وہ بھی سال میں آٹھ مہینے برف باری کی کثرت سے بند رہتا تھا۔ باقی چار مہینوں میں بھی اس درّے پر اس قدر گہری دُھند چھائی رہتی، اس قدر گہری کیچڑ اور پھسلن ہوتی، اتنی گہری کھڈیں درّے کے دونوں طرف واقع تھیں کہ مشکل سے کوئی شیر دل مسافر اکیلا وادی سے ادھر یا وادی سے اُدھر جانے کا حوصلہ کرتا۔ کبھی کبھی دور دراز سے

خچروں اور گھوڑوں پر سامان لادے ہوئے اکا دکا قافلے آتے اور بڑی مشکل سے سامان وادی کے اندر پہنچا جاتے۔ اور وادی میں پیدا ہونے والی اشیاء باہر لے جاتے۔ یہ تجارت بھی گرمی کے دو چار مہینوں ہی میں ممکن تھی جب درے کی برف پگھل جاتی اور برفیلی ہواؤں کے جھکڑ تھم جاتے۔ ورنہ سال کے آٹھ مہینوں میں تو اس وادی کے لوگ باہر کی دنیا سے بالکل الگ تھلگ اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔

اس وادی کے لوگوں نے چونکہ باہر کی دنیا بہت کم دیکھی تھی، اس لئے وہ اپنی وادی ہی کو دنیا کی سب سے خوبصورت وادی سمجھتے تھے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ وادی تھی بہت خوبصورت اور حسین۔ برف پوش چوٹیوں سے نیچے پہاڑوں کی ڈھلانوں پر دیودار اور چیل کے جنگل کھڑے تھے۔ درختوں سے جنگلی انگور کی بیلیں لپٹ لپٹ جاتی تھیں۔ اگر کی جھاڑیوں کے مدوّر سبز پتوں سے سارا بن مہکا ہوا تھا۔ یہاں ہرے رنگ کے طوطے خوشی سے چلّاتے ہوئے ڈال ڈال اڑتے پھرتے تھے۔ اور خوبصورت رت گلے اپنی ست رنگی کلغیاں سر پہ سجائے بنفشے کے کاغذی پھولوں پر لوٹتے پھرتے تھے۔ وحشی آنکھوں والے ہرن اور سفید سمور والے ریچھ اور شہزادیوں کی طرح اٹھلا کر چلنے والی لومڑیاں ان جنگلوں کی زینت تھیں۔ ان جنگلوں سے نیچے گھاٹیوں پہ لانبی لانبی دُوب تھی جو گرمیوں کے دنوں

میں ایسی سُنہری ہو جاتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا زمین سے سورج کی کرنیں پھُوٹ رہی ہیں۔ ایسی گھاس پر وہ بھیڑ بکریاں پلی تھیں جن کی دبیز گھنی اُون اپنی ملائمیت سے کیرا فل اور انگورا اون کو بھی شرماتی تھیں۔

گھاٹیوں کو کاٹ کر وادی کے کسانوں نے صدیوں کی محنت سے اناج بونے کے لئے کھیت تیار کئے تھے، جہاں مکی کاشت ہوتی تھی اور جن کی مینڈھوں پہ سورج مکھی کے پھول جھولتے دکھائی دیتے تھے یا چوڑے چوڑے پتوں والی بیلیں اپنی آغوش میں غذا کے قیمتی خزانے دبائے چھپی رہتی تھیں۔

نیچے وادی میں ندی کے کنارے پھل دار درختوں کے مرغزار تھے۔ اور بید مجنوں کے گھنیرے کنج تھے، جن کی لانبی مخروطی ڈالیاں دور تک پانی میں جھکی ہوئی چلی گئی تھیں۔ اور دور تک دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ندی کے کنارے الھڑ دیہاتی دوشیزائیں سر جھکائے، زلفیں بکھرائے اپنی پتلی انگلیوں کے حنائی پوروں سے پانی میں کھیل رہی ہیں۔

جھیل کے چاروں طرف رنگا رنگ پھولوں کے تختے تھے اور ان کے درمیان ٹھنڈے پانی کی کوکیں چلتی تھیں۔ یہ کوکیں پھولوں کے تختوں سے گذرتی ہوئی دھان کے کھیتوں کی طرف جاتی تھیں۔ اور جب چاندنی چمکتی، جب گڈریئے کی بنسی بجتی، جب دھان کی بالیاں سرسراتیں تو ایسا معلوم ہوتا گویا دھرتی کے رُوم رُوم میں محبت کی بے نام سی مہک رچ رہی ہے۔

دھرتی انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی ہے۔ اور اپنی ادھ مندی آنکھیں کھول کر محبت کے ہولے ہولے، میٹھے میٹھے، دھیمے دھیمے ٹھنڈے سانس لے رہی ہے۔

جھیل کے بیچ میں ایک چھوٹا سا خوبصورت جزیرہ تھا جس پر گاؤں کے سردار کا دو منزلہ مکان تھا۔ اس جزیرے کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی کشتیاں بندھی رہتی تھیں۔ ان کشتیوں کو کھے کر گاؤں کے ماہی گیر مچھلیاں پکڑتے تھے۔ یاقوتی آنکھوں والی مچھلیاں، رنگدار دموں والی مچھلیاں جن کے اندر صرف ایک کانٹا ہوتا ہے۔ مچھلیاں جن کی زریں گردنوں سے ستاروں کی سی کہکشاں پھوٹتی ہے۔

اس وادی کے لوگ مکی اور چاولوں کی کاشت کرتے تھے۔ جنگل سے شہد، بنفشہ اور کستوری اکٹھا کرتے تھے۔ بھیڑوں کی اون اور لومڑیوں کی سمور فروخت کرتے تھے۔ گاتے تھے، ناچتے تھے، شادی بیاہ کرتے تھے بچوں سے کھیلتے تھے، سردیوں میں چیڑھ کی آگ جلاتے اور گرمیوں میں خنک سایوں میں بیٹھتے تھے۔ اور بہت خوش تھے۔ گاؤں کے سردار کے پاس بہت کچھ تھا لیکن وہ خوش نہیں تھا، کیونکہ اس کے پاس کوئی کام نہ تھا۔ وہ دن بھر شکار کھیلتا اور رات کو راگ رنگ کی محفلیں سجاتا۔ لیکن پھر بھی وہ خوش نہیں تھا۔ اس کے پاس وادی میں سب سے زیادہ زمین تھی۔

اس کا مکان سب سے اونچا تھا۔ اس کی بیوی سب سے حسین تھی۔ اس کے بچّوں کے پاس بہترین فرغل تھے۔ اس کے پاس سب سے زیادہ دولت تھی۔ لیکن پھر بھی وہ خوش نہیں تھا۔ اس نے نہ کبھی کام کیا تھا نہ اس کے باپ نے کبھی کام کیا تھا۔ پھر بھی وہ خوش نہیں تھا۔ اور سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ خوش کیوں نہیں ہے۔

سردار کو اپنی وادی سے بڑی محبّت تھی۔ وہ اس خوبصورت وادی کو خوبصورت تر بنانے کے لئے نئے نئے طریقے سوچتا رہتا۔ ایک دن اس نے سوچا۔ یہ وادی دن کو تو بڑی خوبصورت دکھائی دیتی ہے لیکن رات کو جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو یہ کھیت، یہ ندی، یہ مرغزار، یہ پھولوں کے تختے یکایک یوں تاریکی میں گم ہو جاتے ہیں جیسے اس وادی میں تاریکی کے سوا کچھ اور تھا ہی نہیں۔ رات کو یہ وادی کتنی بھیانک اور تاریک معلوم ہوتی ہے۔ جنگلوں سے وحشی جانوروں کی آوازیں ڈراتی ہیں اور تند برفیلی ہواؤں کے جھکڑ خوفناک دیووں کی طرح گرجتے ہوئے وادی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک یوں قدم بڑھاتے چلے جاتے ہیں جیسے اس وادی میں انہیں کا راج ہے، سردار کا راج نہیں ہے۔

سردار پڑھا لکھا اور عقلمند بھی تھا اور وادی میں سب سے زیادہ امیر بھی تھا۔ اس لئے اس نے بہت سوچ سوچ کر وادی کے باہر سے بجلی پیدا کرنے

کی ایک مشین منگائی اور بڑی مشکلوں سے اسے اپنے جزیرے کے ایک کونے میں نصب کرایا۔ تھوڑے ہی دنوں میں وادی کے گھر گھر میں بجلی کی روشنی پہنچ گئی۔ چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر بھی بجلی کے قمقمے سج گئے۔ ندی کے کنارے کنارے ایک خوشنما سڑک بنائی گئی اور اسے بھی بجلی کی روشنی سے آراستہ کیا گیا۔ اور سردار کا گھر تو گویا بجلی کی روشنی سے بُقعۂ نور بن گیا۔ گھر کے اندر اور گھر کے باہر بجلی کے رنگارنگ قمقمے پھولوں کی جھڑیوں کی طرح دُور سے چمکتے ہوئے نظر آتے۔ اور وادی کے لوگ فرطِ مسرت سے ادھر اشارہ کر کے کہتے۔ "وہ دیکھو اس جزیرے کے اوپر ہمارے سردار کا مکان ہے"۔

وادی کے لوگ سردار کی عقلمندی سے بہت مسرور ہوئے۔ اور جب سردار نے یہ طے کیا کہ ہر ایک باشندہ اپنے گھر میں بجلی لگوانے کے لئے اور سڑکوں اور پگڈنڈیوں پر روشنی کرانے کے لئے محصول ادا کرے تو ہر ایک نے اسے خوشی سے قبول کر لیا۔ اب اس محصول سے سردار کو اتنی آمدنی ہونے لگی کہ بجلی کا خرچ نکال کے اور اس کے جزیرے پر روشنیوں کا خرچ نکال کے بھی اس کے پاس ایک معقول رقم ہر ماہ بچ جاتی۔ اتنی آمدنی اسے پچھلے دس سالوں میں بھی نہ ہوئی تھی جتنی اب اسے ایک ماہ میں ہونے لگی۔ محصول اس نے کچھ زیادہ ہی لگایا تھا۔ مگر وادی کے لوگوں نے اس کی پرواہ نہیں کی کیونکہ ان کے گھر میں بجلی آئی تھی اور بجلی کی روشنی

چیڑھ کے شعلوں سے گھر کے مدھم مدھم چراغوں سے ہزار درجہ بہتر تھی، اس لئے انھوں نے زیادہ محصول دے کر بھی برا نہ مانا۔

اس کے بعد سردار کے ذہن میں دوسری ترکیب آئی۔ اس نے سوچا۔ بھولے بھالے کسان دیہاتی اور اس جاہل وادی کے گنوار بڑی مشکلوں سے اس وادی کے مغربی درے کو پار کر کے جاتے ہیں۔ کبھی یہاں دھند ہوتی ہے۔ کبھی پھسلن ہوتی ہے۔ کبھی کسان کھڈوں میں گر کر اپنی جانِ عزیز گنوا بیٹھتے ہیں۔ کبھی ندی کی چڑھتی ہوئی طغیانی کا شکار ہو جاتے ہیں کیوں نہ یہاں ایک پل بنا دیا جائے۔ ایک مضبوط پکا پل جو سال کے بارہ مہینے کام میں آسکے۔ جس کی بدولت اس وادی کا رشتہ باہر کی دنیا سے سال کے بارہ مہینے قائم رہے۔

وادی کے لوگوں کو سردار کی یہ تجویز بھی پسند آئی۔ سب نے اس جہاد میں گرمجوشی سے حصہ لیا۔ اور سب کی محنت سے یہ پل تین ماہ میں تیار ہو گیا۔ سردار نے اس پل پر چوکیدار تعینات کئے جو دن رات پل کی حفاظت کرتے تھے۔ پھر سردار نے پل کا خرچہ نکالنے کے لئے اور پل کی حفاظت کرنے کے لئے ایک محصول لگایا جو پل پر سے گذرنے والے اور وادی کے اندر اور وادی کے باہر جانے والے ہر شخص کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ مگر کسی نے زیادہ برا نہ مانا، کیونکہ پل وادی کے باشندوں کی ایک بہت بڑی

ضرورت کو پورا کرتا تھا۔ اب وہ سال میں بارہ مہینے باہر کی دنیا سے رشتہ رکھ سکتے تھے اور اپنی قیمتی سموروں کو اور فرغلوں کو، اُون کو، شہد کو اور کستوری کو باہر کی دنیا میں بیچ سکتے تھے۔ مہنگے داموں، سستے داموں مگر بیچ ضرور سکتے تھے۔ اس لیئے کسی نے چوں چرا نہ کی اور بجلی کے محصول کے ساتھ ساتھ پُل کا محصول بھی دینے لگے۔

اب سردار کو بجلی کے محصول کے ساتھ ساتھ پل کے محصول سے بھی آمدنی ہونے لگی۔ اس نے اپنے مکان کے اوپر ایک اور منزل بنائی اور اپنے تہ خانے میں طلائی سکوں کے انبار جمع کرنے شروع کر دیئے۔ پہلے اس کے پاس کوئی کام نہ تھا۔ اب اس کے پاس ایک کام آگیا۔ اب وہ دن کے کئی گھنٹے اپنے تہ خانے میں گذارتا۔ طلائی سکوں کو گنتا رہتا۔ ان کی خوش کن جھنکار سُن سُن کر خوش ہوتا رہتا تھا۔

پھر عقلمند سردار نے ایک اور ترکیب سوچی۔ یہ بیچارے جاہل اجڈ کسان اس وادی کی قیمتی پیداوار کو الگ الگ لے جاکر باہر کی دنیا میں بیچتے ہیں۔ اور اکثر دھوکا کھاتے ہیں۔ کبھی ایک قیمتی سمور بیس روپے میں بکتا ہے، تو کبھی وہی سمور دس میں دے آتے ہیں۔ اس سے وادی کی دولت سستے داموں لٹ جاتی ہے۔ سردار نے سوچا کیوں نہ اس سارے کام کو ایک مرکز پر اکٹھا کر دیا جائے۔ کیوں نہ وہ خود ہی اس سارے کام کو سرانجام دے

اس سے کسانوں کو ایک مقررہ رقم بھی ہر سال مل سکے گی اور وہ قیمتوں کی تیزی اور مندی سے چھٹکارا پالیں گے۔ اور خود اسے بھی اس سارے کام کے عوض تھوڑا سا فائدہ ہو جایا کرے گا۔ بس ذرا سا فائدہ۔

لیکن جب اس نے اپنی یہ تجویز وادی کے لوگوں کے سامنے رکھی تو بہت سے لوگوں نے اسے نہیں مانا۔ کیونکہ سردار ہر چیز کے جو دام لگا رہا تھا وہ کم ہی تھے۔ اور بہت سے لوگوں کو باہر سے زیادہ دام مل جاتے تھے یہ صحیح ہے کہ کچھ لوگوں کو اس سے کم دام بھی ملتے تھے لیکن وہ سب اس امید میں دیتے تھے کہ اگلے سال شاید اس سے زیادہ دام ملیں گے۔ اس امید میں بھی وہ لوگ اس تجویز کی مخالفت کرنے لگے۔ چند لوگوں نے حامی بھری۔ مگر بہت سے لوگ سردار کے سمجھانے پر بھی اس کے خلاف رہے۔ ناچار سردار کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ مغربی درّے کے پل پر توپیں نصب کرا دے۔ اور وادی کے لوگوں کا وادی کے باہر آنا جانا بالکل بند کر دے۔ لوگوں نے اس تجویز کو نہ مانا کیونکہ اس سے وادی کی تجارت ایک آدمی کے ہاتھ میں چلی جاتی تھی۔

لیکن جب پل پر توپیں چڑھ گئیں اور پل کی گارد پہلے سے چوگنی کر دی گئی، اور جب لوگوں نے دیکھا کہ اب وہ کسی قیمت پر بھی باہر کی دنیا سے اپنی تجارت قائم نہ رکھ سکیں گے تو سب لوگ سردار کے پاس مجبور

ہو کر آئے۔ اور سردار کی قیمتوں کو منظور کر کے اپنے سمور، فرغل، اون، شہد، پھل، اناج، کستوری بیچ گئے۔ اب جب سردار نے وادی کی ساری پیداوار کو ذرا زیادہ دام بڑھا کے باہر بیچا تو اس کے حصے میں اتنی دولت آئی کہ اس کے تہہ خانے میں طلائی سکوں کے رکھنے کی جگہ نہ رہی۔

اب اس نے ایک اور تہ خانہ بنوایا۔ جزیرے کے گرد فوج کا پہرہ لگا دیا۔ اب وہ لوگوں سے بہت کم ملتا جلتا تھا۔ اب اس کے محصولات کی وصولی کا کام اس کے کارندے کرتے تھے۔ اب وہ اپنا زیادہ وقت اپنے تہ خانے میں سونے کی اشرفیوں سے کھیل کر گزارتا تھا۔ جوں جوں تہ خانوں میں طلائی انبار بڑھنے لگے، سردار کا لالچ بھی بڑھتا گیا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ صرف وہ اس وادی کا بلکہ ساری دنیا کا امیر ترین انسان کہلائے۔ یہی غم اس کو دن رات کھانے لگا کہ کس طرح وہ کوئی ایسی ترکیب نکالے، جس سے اس کی آمدنی اب سے دوگنی ہو جائے۔ یہ اس نے حساب لگایا تھا کہ اگر اس کی آمدنی اب سے دوگنی ہو جائے تو وہ دنیا کا سب سے امیر آدمی ہو جائے گا۔

مگر ایسی ترکیب کیا ہو سکتی ہے۔

وادی کی ساری دولت اس کے پاس تھی۔ وادی کی ساری تجارت اس کے پاس تھی۔ وادی کی ساری زمین اس کے پاس گروی تھی۔ محصول کو بڑھا کر

اور ایک کے بعد دوسرا محصول لگا کر اس نے وادی کے لوگوں کے پاس اب اتنی گنجائش نہ رہی تھی کہ وہ آسانی سے کوئی نیا محصول دینے کو تیار ہو جائیں۔

تو پھر کیا ہو؟

سات دن اور سات راتیں وہ اپنے تہ خانے میں طلائی اشرفیوں کی جھنکار سنتا رہا اور اپنی دولت کو دوگنا کرنے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔ جب ساتویں رات ختم ہو گئی اور آٹھویں دن کی سحر نمودار ہوئی تو وہ اپنے تہ خانے سے نکلا۔ یکایک سورج کی روشنی نے اس کی آنکھوں کو چندھیا دیا، اور اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ اور عین اس وقت اسے خیال آیا کہ اگر کسی طرح دن کو رات کا سا اندھیرا ہو جائے تو پھر...... پھر وہ.......

... وادی کے لوگوں کو دن میں بھی بجلی لینے پر مجبور کر سکتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنی ران پر ہاتھ مار کر واہ واہ کہا۔ اور اسی وقت اپنے قابلِ اعتماد سپاہیوں کو بلایا اور ان سے اپنی ترکیب بیان کی۔

اس ترکیب کو سن کر اس کے قابلِ اعتماد سپاہیوں نے بھی اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے اور توبہ توبہ کرتے ہوئے اس ترکیب پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر سردار اپنے دل میں اپنی دولت کو دوگنا کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس لئے اس نے کسی ایک کی نہ سُنی۔ جن سپاہیوں نے انکار کیا انھیں اسی وقت گولی سے اڑا دیا۔ آخر میں ایک سپاہی جس کا نام ہیرا تھا، بڑی مشکل سے

سردار کی ترکیب پر عمل کرنے کے لئے راضی ہوا۔ سردار نے اسے بہت سی اشرفیاں انعام میں دیں۔ اس کا پچھلا قرضہ بیباق کر دیا۔ اس کی زمین جو گروی پڑی تھی اسے واپس کر دی۔ اور اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ سردار کی بتائی ہوئی ترکیب پر ضرور عمل کرے گا اور کل صبح ہی اسے سرانجام دے گا۔

لیکن دوسری صبح نہیں آئی۔ دوسرے دن لوگ بہت دیر تک سوتے رہے۔ لیکن صبح نہیں آئی۔ پھر وہ جاگ کر آنکھیں مل کر صبح کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ رات سدا ساتھ چلے گی۔ جیسے کبھی صبح نہ ہو گی۔ پھر لوگوں نے اپنے بند گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے کھولے اور آسمان کی طرف دیکھا۔ مشرقی پہاڑوں کی ان چوٹیوں کی طرف دیکھا جن کے پیچھے سے صبح آتی تھی اور سورج نکلتا تھا۔

لیکن آج نہ صبح آئی تھی نہ سورج نکلا تھا۔ بہت دیر تک لوگ صبح کا انتظار کرتے رہے۔ آسمان اور زمین پر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

پھر وادی کے لوگوں نے مشرقی پہاڑوں کے پیچھے سے ایک مدھم سی ملگجی روشنی کی لو دیکھی اس قدر مدھم جیسے اندھیرے میں جگنو کی روشنی اور اس کے بعد جو منظر لوگوں نے دیکھا اس سے کئی تو غش کھا کے گر پڑے۔ بچے ماؤں کی گود میں خوف سے چھپ گئے۔ عورتیں چھاتی کوٹ کر بین کرنے لگیں۔

وادی کے لوگوں نے دیکھا کہ مشرقی پہاڑوں سے آج جو سورج نکلا ہے اس کا

منھ کالا ہے جیسے اس کے چہرے پر کسی نے کالکھ پھیر دی ہو۔ آج سورج میں سے روشنی نہیں آرہی تھی۔ چونکہ روشنی نہیں آرہی تھی اس لئے گرمی بھی نہیں آرہی تھی۔ ایک میلی ملگجی سی روشنی کالے سورج کے گرد ہالہ بنائے نکل رہی تھی جس سے وادی کی ہر چیز ہلکی دھند میں لپٹی تھی اور لوگ دن میں بھی یہ محسوس کرنے لگے جیسے رات ابھی جاری ہے اور صبح کبھی نہ ہوگی۔ بہت سے لوگ پاگل ہو کر وادی میں گھومنے لگے۔ "قیامت آگئی۔ قیامت آگئی۔ بھاگو، دوڑو قیامت آگئی۔ گناہ بخشوالو۔ قیامت آگئی۔"

اسی شور و غل اور آہ و بکا میں دو دن بیت گئے۔ تیسرے دن پھر سورج نکلا، لیکن کالا۔ چوتھے دن بھر لوگوں نے ایک کالے سورج کو نکلتے دیکھا۔ آخر پانچویں دن سب لوگ مل کر سردار کے پاس پہنچے اور اس سے مدد کی التجا کی۔ سردار نے کہا۔ "یہ قہر خدائی ہے تم لوگوں نے کئی بار مجھ سے منحرف ہونے کی کوشش کی ہے۔ یہ اس کا نتیجہ ہے۔ اب بھگتو۔" لوگ گڑگڑائے۔ "نہیں سردار ہم پر رحم کرو۔ ہم غریب آدمی ہیں۔ کوئی صورت نکالو۔"

سردار نے مسکرا کے کہا۔ "ایک ہی صورت ہے، پہلے صرف رات کو بجلی خرچ ہوتی تھی، اب تم لوگوں کو دن کو بھی بجلی استعمال کرنی پڑے گی۔ اور صرف گھروں ہی میں نہیں، بلکہ کھیتوں میں بھی، گھاٹیوں میں بھی، جہاں تم بھیڑ

بکریاں چراتے ہو، اور جنگلوں میں بھی جہاں سے تم لکڑیاں لاتے ہو اور شہد اور کستوری لاتے ہو۔ تمھیں اب دن رات بجلی استعمال کرنی پڑے گی۔ اس لئے مجھے اندر پاور ہاؤس لگانا پڑے گا۔ میرا خرچ چوگنا ہو جائے گا۔ اس لئے اب تمھیں محصول بھی اس نسبت سے چوگنا دینا پڑے گا۔"

لوگ مرتے کیا نہ کرتے۔ انھوں نے چوگنا محصول دینا منظور کر لیا۔ پہلے پہل اس امید پر کہ ممکن ہے کبھی کالے سورج کی جگہ وہی پرانا چمکیلا سورج نکل آئے گا تو وہ محصول دینا بند کر دیں گے۔ لوگ ہر روز صبح اٹھ کر اس خوبصورت سورج کی تلاش میں آسمان کی طرف دیکھتے۔ لیکن ہر روز انھیں مایوسی ہوتی۔ ہر روز وہی کالا سورج نکلتا۔ مشرقی پہاڑوں سے نکلتا اور مغربی پہاڑوں میں جا کے گم ہو جاتا۔ جیسا دن ویسی رات۔ ویسی لوگوں کی اب زندگی ہو گئی۔ ایک مسلسل کالی رات۔ روشنی کیا ہوتی ہے۔ دن کسے کہتے ہیں۔ دھوپ کس طرح چمکتی ہے۔ پھول کیسے مسکراتے ہیں۔ ندی کی لہریں کس طرح روشنی اور سایوں کی شطرنجیں کھیلتی ہیں۔ آنکھوں سے محبت کس طرح جھانکتی ہے۔ جھیل میں زریں گردنوں والی مچھلیاں کس طرح کہکشاں بناتی ہوئی تیرتی چلی جاتی ہیں۔ یہ سب باتیں اس وادی کے لوگ بھول گئے۔

اس طرح بہت دن گذر گئے۔ مہینے گذر گئے، برس گذر گئے۔

وادی پر ایک خوفناک اداسی چھا گئی۔ اب کوئی ہنستا نہیں تھا۔ عورتیں گیت نہیں گاتی تھیں۔ بچے کھیلتے نہیں تھے۔ مرد سر جھکائے کھیتوں میں کام کرتے تھے، مگر پیداوار دن بدن کم ہوتی چلی جاتی تھی۔ پھر پھولوں نے رنگ چھوڑ دیا۔ پھر پھلوں میں مٹھاس نہ رہی۔ پھر پتوں کا رنگ کالا ہو گیا۔ چاولوں کا مزہ مٹی میں تبدیل ہو گیا۔ پھر بچے اندھے پیدا ہونے لگے، کیونکہ جب آنکھوں کو روشنی نہ ملے تو پتلیوں کی کیا ضرورت ہے۔ جب پتلیاں دیکھ نہ سکیں، تو محبت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور جب آدمی محبت نہ کر سکے تو کسی کا ہاتھ پکڑ کر مسکرانے کی کیا ضرورت ہے۔ اور جب آدمی کسی کا ہاتھ پکڑ کے مسکرا نہ سکے تو انسان کہلانے کی کیا ضرورت ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں وادی کے لوگ انسان سے وحشی بنتے گئے۔ چوری، ڈکیتی، قتل، اغوا کے جرائم میں اضافہ ہوتا گیا۔

ادھر جرائم بڑھ رہے تھے ادھر تہہ خانے کے طلائی انبار دن میں اضافہ ہو رہا تھا۔ دولت چاروں طرف سے سمٹ کر ایک تہ خانے میں اکٹھی ہو رہی تھی۔ اور لالچ سے اندھا سردار دونوں ہاتھوں سے اشرفیاں اٹھا اٹھا کر انہیں گیہوں کے انبار کی طرح تہ خانے میں سجاتا تھا۔ اور ان کی جھنکار سن سن کر خوش ہوتا تھا۔ اور مسرت سے پاگل ہو کر وحشیانہ قہقہے لگاتا تھا۔ اسی طرح دن گذرتے گئے۔ مہینے گذرتے

گئے۔ برس گذرتے گئے۔

بڈھا ہیرا اپنے گھر میں مر رہا تھا۔ وہ سفید کوڑھ سے مر رہا تھا مرتے مرتے اس نے اپنے سات سالہ بیٹے کو اپنے پاس بلایا اور اس سے کہا۔

"اِدھر اُدھر دیکھ کر بتا میرے گھر کے آس پاس کوئی آدمی تو نہیں چھپا بیٹھا ہے؟" سات سالہ لڑکے نے گھر کے چاروں طرف چکّر لگایا۔ اور پھر آکے کہا۔ "نہیں کوئی نہیں ہے۔"

بڈھا ہیرا بولا "میں مر رہا ہوں۔ میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے۔"

اس کا بیٹا چپ چاپ سُنتا رہا۔

"اس وادی پر جو یہ شامت آئی ہے وہ میری لائی ہوئی ہے۔ میں مر رہا ہوں۔ لیکن اس مصیبت کو اب تو ہی دور کر سکتا ہے۔"

بیٹا چپ چاپ سُنتا رہا۔

بڈھا ہیرا کھانس کر بولا۔ "سن کان لگا کر سُن۔ اس وادی میں جو کالا سورج نکلتا ہے۔ پہلے اس کا رنگ کالا نہیں تھا۔"

بچے نے کہا۔ "میں نے تو ہمیشہ کالا دیکھا ہے۔ کیا سورج کسی دوسرے رنگ کا بھی ہوتا ہے؟"

بڈھے نے کہا۔ "پہلے اس کا رنگ کالا نہیں تھا۔ میں نے ایک صبح"

"صبح کیا ہوتی ہے؟" بچّے نے پوچھا۔

بڈھا کھانستے کھانستے رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے سوچا میں کیسا ظالم ہوں۔ میرے بچّے نے صبح نہیں دیکھی۔ رنگدار پروں والی تتلیاں نہیں دیکھیں۔ سورج مکھی کا پھول نہیں دیکھا۔ میں کیسا ظالم ہوں۔

"یہ کالا سورج جو روز تو دیکھتا ہے اس کے چہرے پر میں نے ایک روز کالکھ لگا دی تھی۔ میں نے سردار کے کہنے میں آ کے ایک صبح کو مشرقی چوٹیوں کے پیچھے اس سورج کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور اس کے چہرے پر کالکھ لگا دی۔ یہ تو میرے ہاتھوں کا کوڑھ دیکھ رہا ہے۔ یہ اس غلطی کا نتیجہ ہے۔ میں نے چند سونے کی اشرفیوں کی خاطر ساری وادی کے امن و امان، ساری وادی کی خوشی اور مسرّت کو تباہ کر ڈالا ہے۔ سورج کے منھ پر کالکھ لگاتے لگاتے میرے دونوں ہاتھ جل گئے اور میری دونوں آنکھیں اندھی ہو گئیں۔ ورنہ میں نے وادی میں جو تباہی دیکھی ہے اسے دیکھ کر کئی بار میں نے چاہا کہ پھر سے سورج کو صاف ستھرا کر دوں۔ اس کے منھ سے کالکھ اتار کے اسے پھر سے روشن بنا دوں۔ مگر میں اندھا ہوں اب یہ کام تجھے کرنا پڑے گا۔"

بچّے نے کہا۔ "میں اکیلا؟"

"ہاں تو اکیلا، دیکھ میرے بستر کے نیچے تارپین کے تیل کا ڈبہ پڑا ہے۔

اسے میں نے سنبھال کر رکھ چھوڑا ہے۔ سورج کے چہرے پر جو کالکھ جمی ہے وہ اصل میں ٹک ہے۔ یہ ٹک اسی تیل سے چھوٹے گی۔ تو کل صبح مشرقی پہاڑوں کی چوٹی پر چلے جانا۔"

"صبح کس وقت ہوتی ہے؟" بچے نے پوچھا۔

"اب تو مجھے بھی معلوم نہیں۔" ہیرا نے اداسی سے کہا۔

"بہتر تو یہی ہے یہ تیل کا ڈبہ اٹھا کر چل دے۔ رات بھر چلتا رہ۔ پھر جب تو مشرقی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جائے گا تو ذرا اس کے پیچھے جا کے ایک بڑی چٹان پر کھڑا ہو کے سورج کا انتظار کرنا۔ اور جونہی سورج نکلے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے تارپین کے تیل سے نہلا دیجو۔ پھر اس کا چہرہ صاف ہو جائے گا۔ اور پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دیکھ ایک تولیہ بھی ساتھ لے جا۔ اس کا منھ اچھی طرح سے پونچھ دینا تاکہ کہیں کوئی داغ نہ رہنے پائے۔ سمجھا؟"

"جی بہت اچھا۔"

ساتھ سالہ بچہ اپنے مرتے ہوئے باپ سے رخصت ہوا۔ تارپین کا ڈبہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ جنگل میں ریچھ نے اس سے پوچھا۔ "تو کہاں جاتا ہے؟" بچے نے جواب دیا۔ "میں سورج کو نہلانے جا رہا ہوں۔" یہ سن کر ریچھ بھی بچے کے ساتھ ہو لیا۔ آگے بڑھا تو اسے ایک ہرن ملا۔

اس نے پوچھا۔ "بچے تُو کہاں جا رہا ہے؟" بچے نے کہا۔ "سورج کو نہلانے۔" ہرن بھی اس کے ساتھ ہولیا۔ آگے بڑھا تو ایک طوطا اس کے کندھے پر بیٹھ کر ٹیں ٹیں کر کے پوچھنے لگا۔ "بچے بچے ڈبے میں کیا مٹھائی ہے؟" بچے نے کہا۔ "نہیں تارپین کا تیل ہے۔ میں سورج کو اس سے نہلاؤں گا" یہ سن کر طوطا بھی اس کے ساتھ ہولیا۔ بچہ آگے بڑھا تو بندر نے پوچھا۔ "بچے بچے یہ کندھے پر کپڑا کیوں ڈال رکھا ہے؟ اسے مجھے دے دو۔" بچے نے کہا۔ "نہیں بندر میں اس تولیے سے سورج کا منھ پوچھوں گا۔ اس کے چہرے کی کالکھ صاف کر دوں گا۔" یہ سن کر بندر بھی اس کے ساتھ ہولیا۔

بندر نے تولیہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ طوطے نے اپنی چونچ میں تارپین کا ڈبہ پکڑ لیا۔ ریچھ نے بچے کو اپنی پشت پر سوار کر لیا۔ ریچھ بہت تیز گام تھا۔ بندر اور ہرن لمبی لمبی چھلانگیں لگاتے تھے اور طوطا ہوا میں اُڑتا جاتا تھا۔ اس لئے یہ چاروں دوست بہت جلد مشرقی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے اور سورج نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔

بچہ اپنے بڈھے باپ کے کہنے کے مطابق مشرقی پہاڑ کے پیچھے جو اونچی چٹان تھی، اس پر کھڑے ہو کر سورج کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے ارد گرد ہرن، ریچھ، طوطا اور بندر چپ چاپ کھڑے تھے۔

بچّے نے طوطے سے کہا۔ تم ذرا آگے اڑ کر دیکھ آؤ۔ سورج آ رہا ہے کہ نہیں؟ طوطا اڑ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آ کر بولا "ہوشیار، وہ آ رہا ہے۔ کالا سورج۔"

جونہی سورج چٹان کے پیچھے سے نکلا، بچّے نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑنا چاہا۔ لیکن سورج اس کی گرفت سے پھسل کر یکایک اوپر بلند ہو گیا۔ بچّے کے ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکے۔ لیکن بچّے کے ناخنوں کی خراشیں سورج کے کالے چہرے پر تھیں۔ اور جہاں جہاں خراشیں تھیں، وہاں وہاں سے کالکھ کھرچ گئی تھی، اور وہاں سے یکایک نور کا دھارا سوئے زمین بہنے لگا۔

"سورج اندر سے کالا نہیں ہے۔" بچہ خوشی سے چلّایا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سورج کی طرف بڑھائے۔ لیکن سورج اس کے ہاتھوں کی پہنچ سے باہر تھا۔ اور اونچا ہوا جا رہا تھا۔ لیکن بچے اور اس کے دوستوں نے بڑی عقلمندی سے کام لیا۔

چٹان پر پہلے ریچھ کھڑا ہوا۔ ریچھ کے اوپر ہرن، ہرن کے اوپر بندر اور بندر کے اوپر بچّہ۔ بندر نے سورج کی گولائی کو اپنی دم میں باندھ لیا۔ پھر طوطے نے اپنی چونچ سے تارپین کا ڈبہ کھولا۔ اور بچے نے تولیہ اٹھا کر تارپین کے تیل سے سورج کے چہرے کو صاف کرنا شروع کیا۔

جوں جوں وہ سورج کے چہرے کو رگڑتا گیا۔ کالکھ دُور ہوتی گئی۔ اور سورج کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلتی گئی۔

مگر برسوں کی پرانی کالکھ تھی۔ اس لئے بڑی مشکل سے چھوٹتی تھی اور بچے کے ہاتھ بہت چھوٹے تھے۔ اور نہ وہ سورج کو بہت دیر تک مشرقی پہاڑوں پر نہیں روک سکتے تھے۔ اس لئے بچے نے طوطے سے کہا کہ وہ نیچے وادی میں جائے اور بچے کے دوستوں کو خبر کر دے تاکہ وہ اس کی مدد کو فوراً آئیں۔ اس کام میں ذرا بھی دیر نہیں ہونی چاہیئے"۔

طوطا اڑتا ہوا نیچے وادی میں چلا گیا۔ اور چلا چلا کر کہنے لگا۔ "وہ دیکھو، دیکھو ادھر مشرقی پہاڑ پر ایک بچہ سورج کو نہلاتا ہے۔ جس کو آنا ہو مدد کو آجائے۔ جس کو روشنی چاہیئے، مدد کو آجائے۔"

ڈم، ڈم، ڈم

طوطے نے ایک ڈھول گلے میں لٹکا لیا تھا، اور ڈھول بجا بجا کر خوشی سے چیخ رہا تھا۔ اور واقعی لوگوں نے دیکھا کہ مشرقی پہاڑوں سے روشنی پھوٹ رہی ہے۔

سورج ابھی نکلا نہیں تھا۔ لیکن صبح آئی تھی۔

وادی کے لوگ خوشی سے چلانے لگے۔ بچے آگے آگے مشرقی پہاڑوں کی طرف بھاگنے لگے۔ ان کے پیچھے جوان، جوانوں کے پیچھے بڈھے،

بڈھوں کے پیچھے عورتیں۔ یہ سب لوگ بالٹیاں، تولیے، صابن ہاتھوں میں لئے نکل پڑے۔ سب سے آخر میں سردار تھا۔ جو بالکل بے بس ہو کر چلاّ رہا تھا۔ "مت جاؤ۔ میں کہتا ہوں ادھر مت جاؤ"۔

مگر وہ بالکل بے بس تھا۔ آج کوئی اس کی بات نہیں سن رہا تھا۔ نہ اس کی دھمکیوں کی پرواہ کر رہا تھا۔

جیسے لوگوں کو پر لگ گئے ہوں، وہ آن کی آن میں جنگل عبور کر کے مشرقی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ وہاں سب نے مل کر سورج کو نہلایا۔ اس کا بدن اچھی طرح رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ اس کے منھ کو پوڈر لگایا۔ بچے خوشی سے ناچنے لگے۔ عورتیں گیت گانے لگیں۔

جب سورج کا منھ آئینے کی طرح چمکنے لگا تو بندر نے اپنی دم ڈھیلی کر دی۔ اور بچے نے سورج کو اوپر فضا میں یوں اچھال دیا۔ جیسے ایک غبارے کو اڑاتے ہیں۔

اب کے جو سورج مشرقی پہاڑوں سے نکلا تو کالا نہ تھا۔ بلکہ پہلے سے بھی خوبصورت اور چمکیلا ہو گیا تھا۔

نیچے وادی میں نور پھیل گیا تھا۔

ایرانی پلاؤ

آج رات اپنی تھی۔ کیونکہ جیب میں پیسے نہیں تھے۔ جب جیب میں تھوڑے سے پیسے ہوں تو رات مجھے اپنی معلوم نہیں ہوتی۔ اس وقت رات میرین ڈرائیو پر تھرکنے والی گاڑیوں کی معلوم ہوتی ہے۔ جگمگاتے ہوئے فلیٹوں کی معلوم ہوتی ہے۔ ایمبیسیڈر ہوٹل کی چھت پر ناچنے والوں کی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن آج رات بالکل اپنی تھی۔ آج رات آسمان کے سارے ستارے اپنے تھے اور بمبئی کی ساری سڑکیں اپنی تھیں۔ جب جیب میں تھوڑے سے پیسے ہوں تو سارا شہر اپنے اوپر مسلط ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ہر شئے گھورتی ہے، ڈانٹتی ہے۔ اپنے آپ سے دور بیٹھنے پر مجبور کرتی ہے۔ اونی پتلون سے لیکر خوش نما ریڈیوگرام تک ہر چیز کہتی ہے۔ مجھ سے دُور رہو۔ لیکن جب جیب میں ایک پائی نہ ہو اس وقت سارا شہر اپنے لئے بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ہر پتھر پر، گلی کے موڑ پر، بجلی کے ہر کھمبے پر گویا یہ لکھا ہوتا ہے۔ "تعمیر کیا گیا برائے جشن ایک فاقہ مست مصنف"۔ اس دن نہ حوالات کا ڈر ہوتا ہے نہ

گاڑی کے پیپیٹ میں آجانے کا، نہ ہوٹل میں کھانے کا۔ ایک ایسی وسیع بے فکری اور بے کنار فاقہ مستی کا نشہ آور موڈ ہوتا ہے جو میلوں تک پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اس رات میں خود نہیں چلتا ہوں، اس رات بمبئی کی سڑکیں مجھے اُٹھائے اُٹھائے چلتی ہیں۔ اور گلیوں کے موڑ اور بازاروں کے نکڑ اور بڑی بڑی عمارتوں کے تاریک کونے مجھے خود دعوت دیتے ہیں، ادھر آؤ ہمیں بھی دیکھو ہم سے ملو۔ دوست تم آٹھ سال سے اس شہر میں رہتے ہو۔ لیکن پھر بھی اجنبیوں کی طرح کیوں چل رہے ہو۔ اِدھر آؤ، ہم سے ہاتھ ملاؤ،

آج رات اپنی بھی، آج رات کسی کا ڈر نہیں تھا۔ ڈر اُسے ہوتا ہے جس کی جیب بھاری ہوتی ہے۔ اس خالی جیبوں والے ملک میں بھاری جیب والوں کو ڈر ہونا ہی چاہیئے۔ لیکن اپنے پاس کیا تھا جسے کوئی چھین سکتا۔

سُنا ہے حکومت نے ایک قانون بنا رکھا ہے جس کی رُو سے رات کے بارہ بجے کے بعد سڑکوں پر گھومنا منع ہے۔ کیوں کیا بات ہے، رات کے بارہ بجے کے بعد بمبئی میں کیا ہوتا ہے جسے وہ مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں۔ میں تو ضرور دیکھوں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ آج رات تو مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ نہ کسی وزیر کا، نہ کسی حوالات والے کا کچھ بھی ہو جائے

آج تو میں ضرور گھوموں گا اور اپنے دوستوں سے ہاتھ ملاؤں گا۔

یہی سوچ کر میں چرچ گیٹ ریکلے میشن کے سامنے کی سڑک سے گزر کر یونیورسٹی گراؤنڈ میں گھس گیا۔ ارادہ تو یہ تھا کہ میدان کے بیچ میں سے گزر کر دوسری طرف بڑے تار گھر کے سامنے جا نکلوں گا۔ اور وہاں سے فلورا فاؤنٹین چلا جاؤں گا۔ مگر میدان سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک کونے میں چند لڑکے دائرہ بنائے بیٹھے ہیں اور تالی بجا بجا کر گا رہے ہیں۔

تیرا میرا پیار ہو گیا

تیرا میرا

میرا تیرا

تیرا، میرا، پیار ہو گیا

دو تین لڑکے تالی بجا رہے تھے، ایک لڑکا منھ سے بانسری کی آواز نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک لڑکا سر ہلاتے ہوئے ایک لکڑی کے بکس سے طبلے کے بول نکال رہا تھا۔ سب خوشی سے جھوم رہے تھے اور موٹی پتلی اونچی نیچی آوازوں میں گا رہے تھے۔ میں نے قریب جا کر ان سے پوچھا "کیوں بھئی کس کا کس سے پیار ہو گیا؟"

وہ لوگ گانا بند کر کے ایک لمحے کے لئے مجھے دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ پتہ نہیں لوگوں کو دیکھنے میں کیسا لگتا ہوں میں۔ لیکن اتنا مجھے معلوم ہے

کہ ایک لمحے کے لئے دیکھنے کے بعد لوگ بہت جلد مجھ سے گھل مل جاتے ہیں۔ مجھ سے ایسے مانوس ہو جاتے ہیں کہ زندگی بھر کے راز اور اپنی مختصر سی کائنات کی ساری تصویریں اور اپنے دل کے سارے دکھ درد مجھ سے کہنے لگ جاتے ہیں۔ میرے چہرے پر کوئی بڑائی نہیں، کوئی خاص اچنبھے کی بات نہیں۔ کوئی رعب اور دبدبہ نہیں۔ میرے لباس میں بھی کوئی خاص شوکت نہیں --- وہ طنطنہ نہیں جو کالی اچکن اور سرخ گلاب کے پھول میں ہوتا ہے یا شارک اسکن کے سوٹ میں ہوتا ہے۔ بس پاؤں میں معمولی چپل ہے، اس کے اوپر لٹھے کا پاجامہ اس کے اوپر لٹھے کی قمیص ہے، جو اکثر پیٹھ پر سے میلی رہتی ہے۔ کیونکہ ایک تو مجھے اپنے جھونپڑے میں زمین پر سونے کی عادت ہے۔ دوسرے مجھ میں یہ بھی بری عادت ہے کہ جہاں پر بیٹھتا ہوں اکثر دیوار سے پیٹھ لگا کے بیٹھتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ میری زندگی میں میلی دیواریں زیادہ آتی ہیں، اور اجلی دیواریں بہت کم۔ قمیص کمبخت کندھوں سے بہت جلد جاتی ہے اور وہاں اکثر آپ کو ٹانکے دکھائی دیتے ہیں۔ کیونکہ ٹانکے پھٹے ہوئے کپڑے کے دو کناروں کو جوڑنے کا نام ہے۔ پھٹے پرانے کپڑے کو جوڑنے کی بار بار کوشش کی جاتی ہے۔ کیونکہ ہر آدمی کالی اچکن پر سرخ گلاب کا پھول نہیں ٹانک سکتا۔ اس ٹانکے اور اس ٹانکے میں اس قدر فرق کیوں ہے، یہ سچ ہے کہ دو انسان ایک جیسے نہیں ہوتے ایک

شکل و صورت کے نہیں ہوتے ہیں۔ بمبئی میں شب و روز مختلف چہرے
دیکھتا ہوں۔ لاکھوں مختلف چہرے۔ لیکن یہ کیا بات ہے کہ ان سب کے
کندھوں پر وہی ٹانکے لگے ہوتے ہیں۔ لاکھوں ٹانکے پھٹی ہوئی زندگیوں
کے کناروں کو ملانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ ایک نقاد نے میرے
افسانے پڑھ کر کہا تھا کہ مجھے ان میں کسی انسان کا چہرہ نظر نہیں آتا۔ یہی
مجھ میں مصیبت ہے کہ میں اپنے کرداروں کے چہرے نہیں بیان کرتا۔ ان
کے کندھے کے ٹانکے دیکھتا ہوں۔ ٹانکے مجھے انسان کا اندرونی چہرہ دکھاتے
ہیں۔ اس کی دن رات کی کش مکش اور اس کی شب و روز محنت کا سراغ
بتاتے ہیں، جس کے بغیر زندگی کا کوئی ناول اور سماج کا کوئی افسانہ مکمل نہیں
ہوسکتا۔ اس لئے اس بات کی مجھے خوشی ہے کہ میرا چہرہ دیکھ کر کوئی مجھے
کلرک سمجھتا ہے۔ کوئی کباڑیا کوئی کنگھی بیچنے والا یا بال کاٹنے والا۔ آج تک
کسی نے مجھے وزیر یا جیب کاٹنے والا نہیں سمجھا۔ اس بات کی مجھے خوشی ہے
کہ میں ان لاکھوں کروڑوں چھوٹے آدمیوں میں سے ایک ہوں جو بہت جلد
ایک دوسرے سے بغیر کسی رسمی تعارف کے مانوس ہوجاتے ہیں۔

یہاں بھی ایک امتحانی لمحے کی جھجک کے بعد وہ لوگ میری طرف دیکھ کر
مسکرائے۔ ایک لڑکے نے مجھ سے کہا "آؤ بھائی تم بھی یہاں بیٹھ جاؤ اور
اگر گانا چاہتے ہو تو گاؤ۔"

اتنا کہہ کر اس دُبلے پتلے لڑکے نے اپنے سر کے بال جھٹک کر پیچھے کر لیے۔ اور اپنا لکڑی کے بکس کا طبلہ بجانے لگا۔ ہم سب لوگ مل کر پھر گانے لگے۔

تیرا میرا

میرا تیرا

پیار ہو گیا۔

یکایک اس دُبلے پتلے لڑکے نے طبلہ بجانا بند کر دیا اور اپنے ایک ساتھی کو جو اپنی گردن دونوں ٹانگوں میں دبائے اکڑوں بیٹھا تھا، ٹھوکا سا دے کر کہا۔ "ابے مدھو بالا تو کیوں نہیں گاتا"۔

مدھو بالا نے اپنا چہرہ ٹانگوں میں سے بڑی دقت سے نکالا۔ اس کا چہرہ مدھو بالا ایکٹرس کی طرح حسین نہیں تھا۔ ٹھوڑی سے لیکر دائیں ہاتھ کی کہنی تک آگ سے جلنے کا ایک بہت بڑا نشان یہاں سے وہاں تک چلا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جو اس کے گول چہرے پر دو کالی کالی درزیں معلوم ہوتی تھیں۔ انتہائی پریشانی جھلک رہی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ سکیڑ کے طبلے والے سے کہا۔ "سالے مجھے رہنے دے میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے"۔

"کیوں درد ہوتا ہے! سالے تو نے آج پھر ایرانی پلاؤ کھایا ہوگا؟"

مدھو بالا نے بڑے دکھ سے سر ہلایا "ہاں وہی کھایا تھا"۔

کیوں کھایا تھا سالے۔

کیا کرتا۔ آج صرف تین جوتے بنائے تھے۔

ایک اور لڑکے نے جو عمر میں ان سب سے بڑا معلوم ہوتا تھا۔ جس کی ٹھوڑی پر تھوڑی سی ڈاڑھی اُگی تھی اور کنپٹیوں کے بال رخساروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔" اپنی ناک کھجاتے ہوئے کہا"۔ ابے مدھو بالا۔ اُٹھ میدان میں دوڑ لگا۔ چل میں تیرے ساتھ دوڑتا ہوں۔ دو چکر لگانے سے پیٹ کا درد ٹھیک ہو جائے گا"۔

"نہیں بے رہنے دے"۔

"نہیں بے سالے اُٹھ نہیں تو ایک جھانپڑ دوں گا"۔

مدھو بالا نے ہاتھ جوڑ کر کہا" ٹکو رہنے دے۔ میں تیری منت کرتا ہوں۔ یہ پیٹ کا درد ٹھیک ہو جائے گا"۔

"اُٹھ بے۔ کیوں ہماری سنگت خراب کرتا ہے"۔

ٹکو نے ہاتھ بڑھا کر مدھو بالا کو اٹھایا اور وہ دونوں یونیورسٹی کے گراؤنڈ میں چکر لگانے لگے۔ پہلے تو میں تھوڑی دیر تک ان دوڑتے ہوئے لڑکوں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر جب میرے قریب بیٹھے ہوئے لڑکے نے سر کھجا کے کہا" سالی کیا مصیبت ہے ایرانی پلاؤ۔ کھاؤ تو مصیبت ہے،

نہ کھاؤ تو مصیبت ہے"۔ میں نے کہا "بھائی پلاؤ تو بڑے مزے کی چیز ہے۔ اسے کھانے سے پیٹ میں درد کیسے ہو سکتا ہے"؟ میری بات سن کر وہ سب ہنسے۔ ایک لڑکے نے جس کا نام بعد میں مجھے کلدیپ کور معلوم ہوا اور جو اس وقت ایک پھٹی ہوئی بنڈی اور ایک پھٹی ہوئی نیکر پہنے تھا، مجھ سے ہنس کر کہا "معلوم ہوتا ہے تم نے ایرانی پلاؤ کبھی نہیں کھایا"؟

کلدیپ کور نے اپنی بنڈی کے بٹن کھولتے ہوئے مجھے بتایا کہ ایرانی پلاؤ ان لوگوں کی خاص اصطلاح ہے۔ اسے یہ لوگ روز روز نہیں کھاتے۔ لیکن جس دن جس لڑکے نے جوتے بہت کم پالش کئے ہوتے ہیں یا جس دن اس کے پاس بہت کم پیسے ہوتے ہیں اس دن اسے ایرانی پلاؤ کھانا ہی پڑتا ہے۔ اور یہ پلاؤ سامنے کے ایرانی ریستوران سے رات کے بارہ بجے کے بعد ملتا ہے جب سب گاہک کھانا کھا کے چلے جاتے ہیں۔ دن بھر میں جو لوگ ڈبل روٹی کے ٹکڑے اپنی پلیٹوں میں چھوڑ جاتے ہیں۔ ڈبل روٹی کے ٹکڑے گوشت اور ہڈیاں چچوڑی ہوئی، چاول کے دانے، آملیٹ کے ریزے آلو وں کے قتلے، یہ سارا جھوٹا کھانا ایک جگہ جمع کر لیا جاتا ہے۔ اور اس کا ایک ملغوبہ تیار کر لیا جاتا ہے۔ اور یہ ملغوبہ دو آنے پلیٹ کے حساب سے بکتا ہے۔ پیچھے کچن کے دروازے پہ اسے ایرانی پلاؤ کہا جاتا ہے۔ اسے عام طور پہ اس علاقے کے غریب لوگ بھی نہیں کھاتے پھر بھی ہر روز دو تین سو

پلیٹیں بک ہی جاتی ہیں۔ خریداروں میں زیادہ تر جوتے پالش کرنیوالے، فرنیچر ڈھونے والے، گاہکوں کے لئے ٹیکسی لانے والے ہوتے ہیں۔ یا آس پاس کی بلڈنگوں کے بیکار نوکر یا زیرِ تعمیر بلڈنگوں میں کام کرنیوالے مزدور بھی ہوتے ہیں۔

میں نے کلدیپ کور سے پوچھا۔ "تمہارا نام کلدیپ کور کیوں ہے؟" کلدیپ کور نے اپنی بنڈی بالکل اتار دی اور اب وہ بڑے مزے سے لیٹا ہوا اپنا سیاہ پیٹ سہلا رہا تھا۔ وہ میرا سوال سن کر وہیں گھاس پر لوٹ پوٹ ہوگیا، پھر ہنس چکنے کے بعد اپنے ایک ساتھی سے کہنے لگا۔ "ذرا میرا بکسا لانا۔"

ساتھی نے کلدیپ کور کا بکسا لاکر دیا۔ کلدیپ کور نے بکسا کھولا۔ اس میں پالش کا سامان تھا۔ پالش کی ڈبیوں پر کلدیپ کور کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ پھر اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔ "تو بھی اپنا بکسا کھول۔" اس نے بھی اپنا بکسا کھولا۔ اس بکس میں پالش کی جتنی چھوٹی بڑی ڈبیاں تھیں ان پر نرگس کی تصویریں تھیں جو رسالوں اور اخباروں کے صفحوں سے کاٹ کر لگائی گئی تھیں۔

کلدیپ کور نے کہا۔ "یہ سالا نرگس پالش مارتا ہے۔ وہ نمی کا وہ ثریا کا۔ ہم میں سے جتنا پالش والا ہے، کسی نہ کسی فلم ایکٹریس کی تصویر کاٹ کر اپنے ڈبّوں پر لگاتا ہے۔ اور اس کا پالش مارتا ہے۔"

"کیوں؟"

"سالا گاہک ان باتوں سے بہت خوش ہوتا ہے۔ ام اس سے بولتا ہے۔ صاحب کونسا پالش لگاؤں۔ نرگس کہ ثریا کہ مدھوبالا؟ پھر جو گاہک جس فلم ایکٹریس کو پسند کرتا ہے اس کا پالش مانگتا ہے۔ تو ہم اس کو اس لڑکے کے حوالے کر دیتا ہے۔ جو نرگس کا پالش یا نمی کا یا کسی دوسری فلم ایکٹریس کا پالش مارتا ہے۔ ہم آٹھ لڑکے ہیں، ادھر سامنے چرچ گیٹ پر سی بس سٹینڈ کے پیچھے بیٹھتے ہیں۔ جس کے پاس جس ایکٹریس کا پالش ہے وہی اس کا نام ہے۔ اس سے ہمارا دھندا بہت اچھا چلتا ہے اور کام کرنے میں بھی مجا آتا ہے۔"

میں نے کہا "تم ادھر بس اسٹینڈ کے نیچے فٹ پاتھ پر ایرانی ریستوران کے سامنے بیٹھتے ہو تو پولیس والا کچھ نہیں کہتا؟"

کلدیپ کور اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ اب سیدھا ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کو ایک انگلی سے دبا کے اسے یکایک ایک جھٹکے سے یوں نچایا جیسے وہ فضا میں اکنی اچھال رہا ہو۔ بولا "وہ سالا کیا کہے گا؟ اسے دیتا ہے۔ اور یہاں اس میدان میں جو ہوتا ہے اس کا بھی پیسہ دیتا ہے۔ پیسہ؟" اتنا کہہ کے کلدیپ کور نے پھر انگوٹھے سے ایک خیالی اکنی ہوا میں اچھالی۔ اور فضا میں دیکھنے لگا۔ اور پھر دونوں ہاتھ کھول کر

اس نے اس اکنّی کو دبوچ لیا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو کھول کر دیکھا۔ مگر دونوں خالی تھے۔ کلدیپ کور بڑی مزے دار تلخی سے مسکرایا۔ اس نے کچھ نہیں کہا چپ چاپ اوندھا لیٹ گیا۔

نرگس نے مجھ سے پوچھا "تم ادھر دادر میں پالش مارتے ہو نا؟ میں نے تم کو یزداں ہوٹل کے سامنے شاید دیکھا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں مجھ کو بھی ایک طرح کا پالش والا ہی سمجھو۔"

"ایک طرح سے کیا؟" کلدیپ کور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ "سالا سیدھے سیدھے بات کرو نا۔ تم کیا کام کرتا ہے"؟

اس نے مجھے سالا کہا۔ میں بہت خوش ہوا۔ کوئی اور کہتا تو میں اسے ایک جڑ دیتا۔ مگر جب اس لڑکے نے مجھے سالا کہا تو میں بہت خوش ہوا کیونکہ یہاں سالا گالی کا لفظ نہیں تھا برادری کا لفظ تھا۔ ان لوگوں نے مجھے اپنی برادری میں شامل کر لیا تھا۔ اس لئے میں نے کہا۔ "بھائی ایک طرح سے میں بھی پالش والا ہوں۔ مگر میں لفظ پالش کرتا ہوں اور کبھی کبھی چہرے اور کبھی کبھی پرانے میلے چیتھڑوں کو کھرچ کے دیکھتا ہوں کہ ان کی بوسیدہ تہوں میں کیا ہے۔"

نرگس اور نمتی ایک دم بول اٹھے۔ "تو سالا پھر گڑبڑ گھوٹالا کرتا ہے۔ صاف صاف کیوں نہیں بولتا کیا کام کرتا ہے۔"

میں نے کہا۔ میرا نام بشن ہے۔ میں کہانیاں لکھتا ہوں۔ اخباروں میں لکھتا ہوں۔"

"اوہ تو بابو ہے"۔ نمی بولا۔ نمی ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ یہاں دائرے میں جتنے لڑکے تھے ان سب سے چھوٹا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں ذہانت کی تیز چمک تھی اور چونکہ وہ اخبار بھی بیچتا تھا، اس لئے اسے مجھ میں بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس نے میرے قریب آکر کہا"۔ کون سے اخباروں میں لکھتے ہو؟ بھری پریس۔ سنٹل ٹائمز۔ بمبے کرانیکل۔ میں سب اخباروں کو جانتا ہوں۔"

وہ بڑھ کے میرے قریب آگیا۔

میں نے کہا"۔ میں شاہراہ میں لکھتا ہوں۔"

"ساہرہ؟ کون نوز پیپر ہے؟"

"دہلی سے نکلتا ہے"۔

"دلی کے چھاپے خانے سے۔ اوہ"! نمی کی آنکھیں چہرے پر پھیل گئیں۔

"اور ادب لطیف میں لکھتا ہوں"۔ میں نے رعب ڈالنے کے لئے کہا۔

کلدیپ کور ہنسنے لگا"۔ کیا کہا۔ ادبے خلطیف میں لکھتا ہے۔ سالے یہ تو کسی انگلش فلم ایکٹریس کا نام معلوم ہوتا ہے بدبے خلطیف؟ آہاہا۔ ابے

نمی تو اپنا نام بدل کے بدبے خلطیف رکھ لے۔ بڑا اچھا نام معلوم ہوگا۔
ہاہاہا۔" جب سب لڑکے ہنس چکے تو میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا "بدبے خلطیف
نہیں۔" ادب لطیف" لاہور سے نکلتا ہے۔ بہت اچھا پیپر ہے۔"

نرگس نے بے پرواہی سے سر ہلا کے کہا۔" ہاں سالے ہوگا۔ ادبِ
لطیف ہی ہوگا۔ ہم کو کیا۔ ہم اس کو بیچ کے ادھر پیسہ تھوڑی کماتے ہیں۔
کلدیپ کور میری طرف دیکھ کر پھر ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے کہنے لگا۔
مگر یار دیکھنے میں تو تو بالکل لکھاری معلوم نہیں ہوتا۔ بالکل ہماری طرح
پالش والا معلوم ہوتا ہے۔ ہاہاہا۔ وہ سب پھر ہنسنے لگے۔ میں بھی ان
کے ساتھ ہنسنے لگا کہ اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

کلدیپ کور ہنستے ہنستے ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ میری طرف دیکھ کر
بولا۔" اور اس ــــ کہانی سے تم کو کیا مل جاتا ہے؟"
بس تقریباً اتنا ہی جتنا تمھیں ملتا ہے۔ اکثر کچھ بھی نہیں ملتا جب
میں لفظوں پر پالش کر چکتا ہوں تو اخبار والے شکریہ کہہ کر مفت لے جاتے ہیں
اور اپنے رسالے یا اخبار کو چمکا لیتے ہیں!"
تو خالی مغز ماری کیوں کرتا ہے ہماری طرح پالش کیوں نہیں کرتا۔ سچ کہتا
ہوں تو بھی آجا ہماری برادری میں۔ بس تیری ہی کسر تھی۔ اور تیرا نام ہم
بدبے خلطیف ہی رکھ دیں گے۔ ہاہاہا۔" میں نے کلدیپ کور سے ہاتھ ملایا۔

کلدیپ کور کہنے لگا" مگر چار آنے روز پولیس والے کو دینے پڑیں گے۔"

"اور اگر کسی روز چار آنے نہ ہوئے تو۔"

"تو ہم کو مالوم نہیں۔ کسی سے مانگ۔ چوری کر ڈاکہ ڈال مگر سنتری کو چار آنے دینے پڑیں گے اور مہینے میں دو دن حوالات میں رہنا پڑے گا۔"

"ارے وہ کیوں ؟"

"یہ ہم نہیں جانتے۔ سنتری کو ہم ہر روز چار آنے دیتے ہیں۔ ہر ایک پالش والا دیتا ہے۔ پھر بھی سنتری ہر مہینے میں دو دفعہ ہم کو پکڑ کے لے جاتا ہے۔ ایسا اس کا قاعدہ ہے۔ وہ بولتا ہے۔ ام کیا کریں۔"

میں نے کہا۔" اچھا دو دن حوالات میں بھی رہ لیں گے۔"

اور کلدیپ کور نے کہا۔" تم کو مہینے میں ایک بار کورٹ میں بھی جانا پڑے گا۔ تمھارا چالان ہو گا۔ کمیٹی کے آدمی کی طرف سے تم کو کورٹ میں بھی جانا پڑے گا۔ دو روپے یا تین روپے۔ وہ بھی تم کو دینا پڑے گا۔"

"وہ کیوں ؟ جب میں چار آنے سنتری کو دیتا ہوں۔ پھر ایسا کیوں ہو گا ؟"

ارے یار سنتری کو بھی تو اپنی کارگذاری دکھانی ہے کہ نہیں۔ تو سمجھتا نہیں ہے سالے بدبے خلیطف ؟

میں نے آنکھ مار کر کلدیپ کور سے کہا۔" سالے سب سمجھتا ہوں۔ ہم دونوں

ہنسنے لگے۔ اتنے میں مدھو بالا اور گکو دونوں میدان کے چکر لگا کر پسینے میں ڈوبے ہوئے واپس آ گئے۔

میں نے مدھو بالا سے پوچھا "تمہارا پیٹ کا درد غائب ہو گیا؟"

مدھو بالا بولا۔ "درد تو غائب ہو گیا۔ مگر اب بھوک بڑے زور کی لگی ہے۔"

نرگس نے کہا۔ "اور مجھے بھی۔"

نمی نے سر ہلا کر کہا۔ "تو کیا پھر ایرانی پلاؤ آئے گا؟ پھر پیٹ میں درد ہو گا۔ پھر میدان کے چکر اور پھر بھوک؟" کلدیپ کور نے بڑی تلخی سے کہا۔

نمی نے کہا۔ "میں دو پیسے دے سکتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ایک آنہ میری طرف سے۔"

سب مل کر چار آنے ہوئے۔ نمی کو ایرانی پلاؤ لانے بھیجا گیا کہ سب سے چھوٹا وہی تھا۔ پھر ایرانی ریستوران کا باورچی اسے پسند بھی کرتا تھا۔ ممکن ہے نمی کو دیکھ کر چار آنے میں دو پلیٹوں کے بجائے تین پلیٹیں یا کم از کم تین پلیٹوں کا مال مل جائے۔"

جب نمی چلا گیا تو میں نے پوچھا "کیا تم لوگ ہر روز یہیں سوتے ہو؟"

"مدھو بالا کے سوا اور سب یہیں سوتے ہیں"۔ گکو نے کہا۔ "مدھو بالا اپنے گھر جاتا ہے۔ مگر آج نہیں گیا۔"

میں نے مدھو بالا سے پوچھا "تمہارا گھر ہے؟"

"ہاں۔ سائین میں ایک جھونپڑا ہے۔ ماں وہاں رہتی ہے۔"

"اور باپ ؟"

مدھوبالا نے کہا۔ "باپ ؟ باپ کا مجھے کیا پتہ ؟ ہوگا سالا سامنے والی کسی بلڈنگ کا سیٹھ۔"

یکایک وہ سب چپ ہو گئے۔ جیسے کسی نے ان کے چہرے پر چپت مار دی ہو۔ لڑکے جو بے آسرا تھے، بے گھر تھے، بے نام تھے۔ جنھوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ آنے والی محبت کو فلمی گانوں سے بھرنے کی کوشش کی تھی۔

'تیرا میرا پیار ہوگیا۔ کدھر ہے تیرا پیار ؟ اے میرے باپ اے میری ماں۔ اے میرے بھائی تو کون ہے ؟'

تو کون تھا ؟ کس لئے تو مجھے اس دنیا میں آیا اور ان سخت بے رحم عمارتوں کے ٹیکس زدہ فٹ پاتھوں پر دھکے کھانے کیلئے چھوڑ دیا گیا ایک لمحے کے لئے ان لڑکوں کے فق، فریادی چہرے کسی نامعلوم ڈر سے خوفزدہ ہو گئے۔ اور بڑی سختی سے انھوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لئے، جیسے کہیں سے انھیں آسرا نہ ملا۔ جیسے اس شہر کی ہر بڑی عمارت ہر فٹ پاتھ اور ہر چلنے والے قدم نے انھیں ٹھکرا دیا۔ اور انھیں مجبور کر دیا کہ وہ رات کی تاریکی میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیں۔ مجھے وہ اس وقت ایسے ہی خوفزدہ اور معصوم معلوم ہو رہے تھے جیسے بھولے بھالے

بچے کسی نامعلوم بے کنارہ جنگل میں کھو جائیں۔ اسی لئے بمبئی کبھی کبھی مجھے ایک شہر نہیں معلوم ہوتا، ایک جنگل معلوم ہوتا ہے، جس میں معاشرے کی بے نام اولاد سڑکوں کی بھول بھلیوں میں اپنا راستہ ٹٹولتی معلوم ہوتی ہے اور جب راستہ نہیں ملتا تو آنکھیں بند کر کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ جاتی ہے۔

پھر میں سوچتا ہوں ایسا نہیں ہے۔

بمبئی ایک جنگل نہیں ہے۔ شہر ہے۔ لوگ کہتے ہیں اس کی ایک میونسپل کارپوریشن ہے۔ اس کی ایک حکومت ہے ایک نظام ہے۔ اس کی گلیاں ہیں، بازار ہیں، دکانیں ہیں۔ راستے ہیں اور گھر ہیں۔ اور یہ سب ایک دوسرے سے ایسے جڑے ہوئے ہیں، جیسے ایک مہذّب اور متمدن شہر میں چیزیں ایک دوسرے سے منسلک ہوتی ہیں۔ یہ سب میں جانتا ہوں۔ اس کے رستے اور گھروں کو پہچانتا ہوں۔ ان کی عزت اور احترام کرتا ہوں۔ لیکن اس عزت اور احترام، اس محبت کے باوجود میں یہ کیوں دیکھتا ہوں کہ اس بمبئی شہر میں کتنی ہی گلیاں ایسی ہیں جن سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ کتنے ہی راستے ایسے ہیں جو کسی منزل کو نہیں جاتے، کتنے ہی بچے ایسے ہیں جن کے لئے کوئی گھر نہیں ہے۔

یکایک اس خاموشی کو ممی نے توڑ دیا۔ وہ بھاگتا ہوا ہمارے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایرانی پلاؤ کی تین پلیٹیں تھیں۔ ان سے گرم گرم سوندھا سوندھا

دھواں اُٹھ رہا تھا۔ جب اس نے پلیٹیں لا کر گھاس پہ رکھ دیں تو ہم نے دیکھا کہ نمی کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

"کیا ہوا" کلدیپ کور نے پوچھا۔

نمی نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ "باورچی نے بڑے زور سے یہاں کاٹ کھایا۔" نمی نے اپنا بایاں رخسار ہماری طرف کر دیا۔

ہم نے دیکھا بائیں رخسار پر بہت بڑا نشان تھا۔

کلدیپ کور نے باورچی کو گالی دیتے ہوئے کہا۔ "حرام زادہ۔" مگر اس کے بعد وہ سب لوگ ایرانی پلاؤ پر ٹوٹ پڑے۔

آسمان بنانے والے

میرے بچے نے مجھ سے پوچھا "یہ آسمان کیسے بنایا گیا ہے؟"
میں نے کہا۔ "مجھے تو معلوم نہیں کیا تم مجھے بتا سکتے ہو"۔
بچے کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ کچھ سوچنے لگا۔ آخر سوچ سوچ کر بولا۔
"ایک دفعہ بہت سے آدمی ایک جگہ سگریٹ پی رہے تھے۔ ان کے سگریٹوں کا دھواں اوپر اُٹھا اور اوپر اُٹھ کر آسمان بن گیا"۔

بچے کے جواب میں کوئی جدت نہ تھی۔ اس نے مجھے اکثر سگریٹ پیتے ہوئے دیکھا۔ میرے دوستوں کو اس شغل میں مصروف دھواں اڑاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس دھوئیں سے اس نے اپنے لئے آسمان بنا لیا۔ اس بات میں کوئی جدت نہ تھی اس بات میں ایک بات ضرور تھی کہ اس نے ایک آدمی کے بیٹے سے آسمان بنوایا تھا۔ اس نے اس کام کو خدا پر نہیں چھوڑا تھا۔ ہم میں سے کتنے ہی لوگ ہر کام خدا پر چھوڑ دیتے ہیں، اور خود کچھ نہیں کرتے۔ پھر یہ بات بھی عجیب تھی کہ آسمان بنتا ہے۔ انسان کی کاوش سے بنایا جاتا ہے میرے ذہن میں تاریخ اپنے اوراق

الٹنے لگی۔ اور بہت سے آسمان بنانے والوں کی کہانیاں مجھے یاد آنے لگیں۔ میں نے اپنے ننھے بچے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: "میں آج تمھیں آسمان بنانے والوں کی کہانی سناؤں گا۔ یہ کہانی بادشاہ بنانے والوں کی کہانی سے کہیں دلچسپ ہے۔"

آج سے ہزاروں سال پہلے آسمان یہ آسمان نہیں تھا جس میں سیارے گھومتے ہیں اور ستارے خلا میں پرواز کرتے ہیں۔ اس وقت آسمان ایک پرستان کہانی کی طرح مبہم اور پراسرار تھا۔ اس وقت زمین ایک چپٹا دائرہ تھی اور آسمان جست کے الٹے پیالے کی طرح اس پر رکھا ہوا تھا۔ صبح کو سحر کی دیوی اس آسمان کے مشرقی دروازے کھول دیتی اور چار گھوڑوں والے رتھ کی زنجیریں کھول دیتی۔ سورج کا دیوتا اپنا زریں تاج پہن کر رتھ میں سوار ہو جاتا۔ تیز رفتار رتھ اپنے سفر پہ چل دیتا۔ شام کے وقت مغربی سمندر میں آسمان کے مغربی دروازے کھلتے اور سورج اپنے رتھ کو دوڑاتا ہوا اس دروازے کے اندر جا کر رات کی رانی کی مملکت میں داخل ہو جاتا۔ پرانے یونانی ایسا سوچتے تھے۔

لیکن ان سے بہت پہلے بابلیوں نے اس سوال کا جواب دینا چاہا تھا۔

آسمان کیسے بنایا گیا ہے؟

بابلیوں نے کہا "پہلے آسمان نہیں تھا کچھ بھی نہیں تھا۔ پہلے صرف ایک خدا تھا اس کا نام عاپسُو تھا۔ اس کی ایک بیوی تھی۔ اس کا نام طیامت تھا۔ اس وقت تک مندر تعمیر نہیں ہوئے تھے اور دیوتا وجود میں نہیں آئے تھے اس وقت زمین نہیں تھی اور آسمان نہیں تھا اور کسی چیز کا کوئی نام نہیں تھا۔

پھر عاپسُو نے طیامت کے بطن سے دیوتا پیدا کئے اور انہیں نام دیئے اور انہیں قوتیں بخشیں۔ دیوتاؤں نے قوت پاکر اپنے خالق سے جھگڑا شروع کیا۔ عیّا دیوتا نے عاپسُو خدا کو مار ڈالا اور مردوک دیوتا نے طیامت کے دو ٹکڑے کر دیئے جیسے آدمی سیپی کو بیچ میں سے چیر دے۔ سیپی کا نچلا حصّہ گر کر زمین بن گیا اور اوپر کا حصّہ آسمان کہلایا۔ اس طرح آدمی کے تخیل نے سب سے پہلے آسمان بنایا اور اسے ایک پرستانی کہانی کا روپ دیا۔ بابلیوں کے سینکڑوں سال بعد رومن شاعر رووڈ نے سورج دیا اور اس کے بیٹے فنٹن کی کہانی سنائی۔

ایک دفعہ سورج نے زمین کی ایک لڑکی سے شادی کی۔ دونوں کی شادی سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام فنٹن تھا۔ فنٹن کا باپ سورج لازوال تھا۔

لیکن فٹن کی ماں ہماری دنیا کی رہنے والی تھی۔ اس لئے فانی تھی۔ فٹن جب بڑا ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کا بیٹا نہیں ہے۔ وہ لازوال سورج کا بیٹا ہے۔ وہ ہر روز اپنے باپ کو چار گھوڑوں کے سنہری رتھ میں بیٹھ کر شعلوں کا بھڑکتا ہوا تاج پہنے مشرق سے مغرب کو جاتے دیکھتا اور اس کے دل میں اپنے باپ سے ملنے کی خواہش بڑی شدت سے جاگنے لگی۔

ایک روز وہ اپنی ماں کے منع کرنے کے باوجود اپنے باپ کے دربار میں چلا گیا۔

دربار سونے کا بنا ہوا تھا۔ اور اس کے ہر کونے سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ سورج اپنے شاندار جگمگ جگمگ کرتے ہوئے تخت پر بڑی شان سے بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں بائیں گھنٹے گھڑیاں پہنے سال صدیاں اور قرن مودّب کھڑے تھے۔ بہار کی حسین شہزادی اپنے ماتھے پر پھولوں کا تاج پہنے رقص کر رہی تھی۔ اس کے قریب انگوروں کی بیلوں میں لپٹی ہوئی خزاں تھی۔ گرما کی نازک کمر میں دھان کے خوشوں کی پیٹی لپٹی ہوئی تھی اور اس کے قریب زمستان کی بڈھی، دیوی برف کے گالوں کا لباس پہنے چپ چاپ کھڑی تھی اور اس کی ہر سانس طوفان کے تند خو فراٹوں کو جگاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

سورج نے فٹن سے پوچھا تم کون ہو۔ یہاں کیوں آئے ہو؟"

فٹن بڑی دلیری سے آگے بڑھ گیا۔ اور دربار کے عین بیچ میں جا کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے باآواز بلند سب کے سامنے کہا "میری ماں نے کہا ہے کہ میں تمھارا بیٹا ہوں۔ کیا یہ سچ ہے؟"

سورج نے فٹن کو آگے اس کے قریب آجانے کو کہا۔ جب فٹن سورج کے قریب پہنچا تو سورج نے اپنا شعاعوں والا تاج اتار دیا۔ اور غور سے اپنے بیٹے کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ یکایک اس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی اور اس نے چلا کر کہا "فٹن تم میرے بچے ہو۔ واقعی میرے بیٹے ہو"

سورج نے فٹن کو گلے سے لگا لیا۔ اور اس سے پوچھا "بتاؤ تمھیں کیا چاہیئے۔ میں اسے ضرور پورا کروں گا۔ بتاؤ بیٹے تمھیں کیا چاہیئے۔"

فٹن نے فوراً جواب دیا "میں ایک دن کے لئے تمھارے زریں رتھ کو خود چلانا چاہتا ہوں"

"مگر یہ رتھ تو سورج کے سوا اور کوئی نہیں چلا سکتا" سورج نے کہا۔
"آپ نے وعدہ کیا ہے"

سورج نے اپنے بیٹے کو بہت سمجھایا۔ مگر فٹن نہیں مانا۔ اب بحث کرنے کے لئے زیادہ وقت نہیں تھا۔ کیونکہ حنائی انگلیوں والی کرن نے مشرق

کے گلابی دروازے کھولنے شروع کر دیے تھے اور بے چین پل گھڑیاں اور گھنٹے بیقرار گھوڑوں کو اصطبل کے باہر لا رہے تھے اور انھیں شعاعوں کے رتھ میں باندھ رہے تھے۔

سورج نے اپنے بیٹے فٹن کو دیوتاؤں کی پوشاک اُڑھائی تاکہ وہ اس سفر پہ چلنے سے محفوظ رہے۔ اس نے ایک بار پھر اسے اس سفر پہ جانے سے روکا۔ مگر جواں سال فٹن پہلے ہی سے سورج کے رتھ میں سوار ہو گیا تھا۔ شعلہ ساماں گھوڑوں کی طنابیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔

دیکھو بیٹا" سورج نے آخری بار اس سے کہا۔ زمین کے بہت قریب مت جانا۔ ورنہ زمین جل جائے گی۔ آسمان کے قریب مت جانا ورنہ آسمان جل جائے گا۔ بڑی احتیاط سے زمین اور آسمان دونوں کے بیچ میں سفر کرنا۔ جیسے میں ہر روز کرتا ہوں۔"

"آپ بالکل فکر نہ کریں۔ فٹن نے اپنے باپ کو جواب دیا" میں بڑے مزے سے اس رتھ کو چلا کے لے جاؤں گا" سمندر کی دیوی نے دروازے کھول دیے۔ اور گھوڑے سرپٹ بھاگنے لگے۔ آج وہ سورج کا وزن محسوس نہیں کر رہے تھے۔ طنابوں میں وہ کھچاؤ نہیں تھا۔ وہ مہمیز جو سورج کے ہاتھوں میں تھے تازہ دم گھوڑوں نے بے مہار بھاگنا شروع کر دیا۔ قطبی ستارے نے انھیں اپنے راستے سے ہٹ کر بھاگتے ہوئے

دیکھا اور خوفزدہ ہوگیا۔

فٹن نے گھبرا کے نیچے دیکھا زمین، دور نیچے تک چاروں طرف پھیلتی جارہی تھی۔ دریا پہاڑ بر اعظم گرتے جارہے تھے۔ فٹن کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اس نے پیچھے مڑکر دیکھا۔ لیکن مشرقی دیوی نے اپنے دروازے بند کرلئے تھے۔ اور اب وہ پیچھے نہیں جاسکتا تھا۔ آگے کے سفر کا اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ آسمان میں غیر متوازن کشتی کی طرح کبھی ادھر کبھی اُدھر ڈولنے لگا۔ گھوڑے بے قابو ہو کر کبھی آسمان سے باتیں کرنے لگتے اور کبھی زمین کے اس قدر قریب آجاتے کہ چوٹیوں سے برف پگھلنے لگتی۔ جنگلوں کو آگ لگنے لگی۔ کھیتیاں جل کر صحرا ہونے لگیں، مچھلیوں نے سمندر کے گہرے پانیوں میں پناہ لی۔ اور دھرتی نے گھبرا کر زیوس دیوتا کو مدد کے لئے پکارا۔

زیوس دیوتا نے اولمپس کی چوٹی سے فٹن کو رتھ میں پریشان حال گھوڑوں کی طنابیں اپنے ہاتھ سے چھوڑتے ہوئے دیکھا۔ اس نے سوچا اگر سورج کا رتھ زمین سے ٹکرا گیا تو یہ زمین ٹکڑے ہو جائے گی۔ اس لئے اس نے رتھ پر اپنی بجلی کے تیر پھینکے۔ ان تیروں نے رتھ کی زنجیروں کو توڑ دیا۔ گھوڑے آزاد ہوگئے اور رتھ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ یکایک فٹن آسمان سے ایک شہاب ثاقب کی طرح زمین پر گرا۔ دریائے

ایری ڈانوس کے پانیوں نے اسے اپنی مہربان آغوش میں لے لیا۔ ناہید نے اس کا منھ دھویا۔ اور اسے ایک چھوٹی سی قبر میں سلا دیا اور اس کی قبر کے اوپر لکھ دیا۔

'یہاں فٹن سو رہا ہے۔

جس نے اپنے باپ سورج کے رتھ کو چلانے کی کوشش کی۔

اس نے اپنی بساط سے زیادہ دلیری دکھائی اور اس لئے مارا گیا'۔

لیکن کیا یہ کہانی محض اووڈ کا تخیل ہے؟ کیا ہم میں سے ہر شخص سورج کا بیٹا نہیں ہے جسے سورج کا رتھ چلانے کی آرزو ہے ہزاروں سال سے انسان آسمان پر اپنا پہیہ چلانے کی سوچ رہا ہے۔ پہلے صرف سوچ تھی اور تخیل تھا۔ اس لئے ڈر تھا۔ اور کائنات مبہم اور پراسرار تھی اور آسمان جست کے الٹے پیالے کی طرح اوندھا تھا۔ پھر انسان نے اپنی عقل کو عمل کے گھوڑوں سے باندھا اور رتھ کو چلانا شروع کیا۔

جس نے سب سے پہلے اس کام کو سرانجام دیا۔ وہ بے نام تھا۔ وہ ایک ملاح تھا یا شاید خشکی پر رات کی تنہائی میں سفر کرنے والا اکیلا مسافر وہ فٹن کی طرح رستے سے بھٹکتا جا رہا تھا۔ زمین پر اپنی منزلِ مقصود کو پانے کے لئے اس نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں ستارے تھے

اور سیارے تھے چاند تھا اور کہکشاں کا جھولا تھا۔ یکایک اس نے قطب تارے کو دیکھا۔ جو ہمیشہ رات کے وقت شمال کی طرف اشارہ کرتا ہے یکایک انسان نے ستاروں کے ڈھیر میں سے ایک کنکر چن لیا اور اس سے آسمان کی تعمیر کے لئے سنگ بنیاد رکھا۔ آج ستارے اس کے لئے دیوتا نہیں تھے، اس کے ہاتھ میں کمہار کی مٹی کی طرح چکنے اور نرم تھے جن سے وہ اپنا آسمان بنا سکتا تھا۔

قطب تارا!

اس سنگِ بنیاد کو لے کر بابلیوں نے اپنے آسمان کی تعمیر کی۔ اس آسمان پر سات منزلیں تھیں۔ اور آسمان ایک بلند زینے کی طرح ایک منزل سے اوپر دوسری منزل کو جاتا تھا۔ یہ سات منزلیں سات سیاروں کے محل تھے۔ پھر انھوں نے سات سیاروں کے نام پر سات دن بنائے۔ سوموار۔ منگل۔ بدھ۔ برہسپت۔ شکر۔ سنیچر۔ اور اتوار۔ انھوں نے ہر گھنٹے کو ساٹھ منٹوں میں تقسیم کیا۔ ہر منٹ کو ساٹھ سیکنڈوں میں تقسیم کیا اور ہر دائرے کو تین سو ساٹھ درجوں میں بانٹا۔ اور ہر لحظہ آسمان کا نقشہ اُبھرتا گیا۔

پھر مصریوں نے بابلیوں کے بعد ایک آسمان بنایا۔ یہ آسمان ہوا کا دیوتا تھا جو اپنے دونوں ہاتھوں سے اوپر بہشت کو تھامے ہوئے تھا۔

ہوا میں ستارے چمکتے تھے اور سورج اور چاند ہوا کی لہروں پر پھسلتے گذرتے جاتے تھے۔ آسمان اب ایک چھوٹا سا محل نہ رہا۔ سات منزلوں والا۔ اس کی حدیں مصریوں نے ہوا کی طرح وسیع کردیں۔

ایک روز طیلس یونان سے مصر گیا۔ نمک لانے کے لئے۔ نمک لانے کے علاوہ اس نے مصریوں سے آسمان سازی کا کام بھی سیکھا۔ وہاں اس نے معلوم کیا کہ سورج کا قطر آسمان کی گولائی کے قطر کا ایک بٹا سات سو بیس ہے۔ لیکن جو بات اس نے خود سے معلوم کی وہ یہ تھی کہ سورج ایک دیوتا نہیں ہے۔ سورج کا خمیر بھی انہیں عناصر سے اُٹھایا گیا ہے جن سے زمین بنی ہے۔ اور جب یہ معلوم ہو گیا تو گویا زمین اور آسمان میں کوئی فرق نہ رہا۔ انسان نے اپنے ہاتھ میں مادّے کو پکڑ لیا اور اسے اِدھر اُدھر سے ٹٹولنے لگا اور سمجھنے لگا۔

طیلس کے شاگرد اناکسی منیڈر نے آسمان اور زمین کو بار بار ٹٹولا۔ اور اپنی کتاب "قدرت کے بارے میں" بتایا کہ زمین ایک گول کشتی کی طرح پانی پر نہیں تیر رہی ہے، جیسے کہ طیلس سمجھتا تھا۔ زمین ایک بہت بڑے سلنڈر کا حصہ ہے اور فضا میں معلق ہے۔ اسے نہ کوئی اوپر سہارا دینے والا ہے نہ نیچے سہارا دینے والا ہے۔ وہ خود بخود ایک لامکاں میں معلق ہے۔

یکایک آسمان کی چھت بھک سے اڑ گئی۔ وہ سات منزلوں والا محل زمین پر آ گرا اور اس کے بجائے انسان نے ایک دوسرا آسمان تعمیر کیا۔ چاروں طرف پھیلا ہوا لامحدود۔ اور اس لامحدود آسمان میں ستارے چکر کھا رہے ہیں۔ پھر کچھ عرصے کے بعد انا کسی مینڈر کے شاگرد انا کسی پیڈر نے آسمان سازی کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور ہمیں بتایا کہ ستاروں میں کچھ تو سیارے ہیں جو ہماری زمین کے قریب ہیں دوسرے ایسے ستارے ہیں جو ہم سے بہت دور ہیں۔ اور آسمان میں کیلوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔

ایتھنز کی چاندنی رات۔

پریکلیز کے گھر میں ایک دعوت پر بہت سے معزز مہمان شریک تھے۔ پریکلیز کی حسین بیوی عسپاشیا جو غیر یونانی تھی، فدیاس مشہور بت ساز، یوریپڈیس اور دوسرے مصور اور فوج کے کپتان جن کا بہادری میں کوئی ثانی نہ تھا۔ یہ لوگ ایک نیم دائرے کی صورت میں کوچوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے چھوٹی چھوٹی میزوں پر مئے ارغوانی سے لبریز جام رکھے تھے۔ طشتریوں میں انگور کے گچھے چمک رہے تھے۔ اور یہ سب معزز مہمان ایتھنز کی سیاسی گفتگو میں شرکت کے لئے اکٹھے نہیں ہوئے تھے۔ ان کے سامنے کرسی پر انا کسی گوراسی بیٹھا تھا۔ ایک نیا مفکر، ایک نیا آسمان ساز۔

زمین کے رہنے والوں کو ہمیشہ آسمان نے اپنی طرف کھینچا ہے۔ اناکسی گوراسی نے بھی ستاروں پر اپنی کمند پھینکی تھی۔ اور اب وہ اپنے تجربے یونانی دانشوروں کے سامنے بیان کر رہا تھا۔

اور وہ لوگ حیرت سے سن رہے تھے کہ ان کی اس دنیا کے باہر بھی اور بہت سی دنیائیں ہیں۔ چاند میں پہاڑ ہیں اور وادیاں ہیں اور وہاں درخت اور جاندار ہیں۔ سورج ایک گرم پتھر ہے۔ بہت وسیع و عریض پتھر جو ہمیشہ گھومتا رہتا ہے اور جس کی ہواؤں میں آگ کے شعلے ہیں۔ اور جب سورج تیز رفتاری سے گھومتا ہے تو اس کے بدن میں چنگاریاں پھوٹتی ہیں۔ تیزی سے گھومتے گھومتے سورج گرم اور گرم ہو جاتا ہے۔ اور حرکت کی تیز رفتاری سے سورج کے جسم سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے الگ ہو جاتے ہیں۔ اور ان ٹکڑوں میں سے جب کوئی چھوٹا سا ٹکڑا زمین پر آگرتا ہے تو وہمی لوگ اس کے قریب جانے سے بھی ڈرتے ہیں۔ حالانکہ وہ اگر اسے ہاتھ میں لے کر دیکھیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ یہ ٹکڑا دیوتاؤں کا کوئی جادو نہیں ہے ان کی زمین کی طرح ہی ایک قسم کی چٹان کا ٹکڑا ہے۔

معزز مہمان مسرت اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے اناکسی گوراسی کی باتیں سن رہے تھے۔ یہ آسمان وہ آسمان نہ تھا جو بابلیوں نے تعمیر

کیا تھا۔ وہ آسمان نہ تھا جو مصریوں نے بنایا تھا۔ وہ آسمان نہ تھا جو اناکسی مینڈر نے تعمیر کیا تھا۔ ان تمام آسمانوں کی جھلک اس نئے آسمان میں ملتی ہے۔ مگر یہ آسمان ان سب سے بہتر اور سچائی کے کس قدر قریب تر معلوم ہو رہا تھا۔ اس آسمان میں بھی بہت سے ان جانے ان دیکھے ہوئے کونے تھے، جہاں تاریکی تھی جہاں انسان اپنی عقل کی روشنی اور اپنے تجربے کی سچائی نہیں لایا تھا۔ جہاں ابھی عمارت اُٹھی بھی نہ تھی صرف بنیادوں کی اینٹیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ پھر بھی آسمان کی یہ عمارت پرانی عمارتوں سے کس قدر خوبصورت جامع اور افضل تھی۔ دعوت ختم ہو گئی اور اناکسی گوراسی ایتھنز کی چاندنی سے دُھلی ہوئی گلیوں میں گھومنے لگا۔ اکروپولس کی عظیم عمارت ایتھنز کے شہر کے اوپر ایک خوابناک خاموشی میں کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔ لائم کے پیڑ چاندنی کے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اگورا کی مارکیٹ میں مکمل سناٹا تھا۔

یکایک اناکسی گوراسی گلی کے فرش پر کھڑا ہو کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بالکل نئی آنکھوں سے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ اس آسمان میں اسے کہیں پُرانے یونانیوں کی اپسرا اندر ومیدا سپید گھوڑوں والے رتھ پر سوار ہو کر گذرتی ہوئی دکھائی نہ دی۔ کہیں پر اُسے پرسیس نظر نہ آیا۔ جو اپنا بھالا اُٹھائے کسی ڈریگن کا سینہ چیرنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔

اس آسمان کی پہنائیوں میں لاکھوں دُنیائیں آباد تھیں۔ لاکھوں ستارے فضا میں گردش کر رہے تھے۔ کیا ان تمام دنیاؤں میں کہیں پر زندگی کا کوئی وجود نہیں ہے؟

یہی سوچتے سوچتے اسی گلی کے فرش پر کھڑے اناکسی گوراسی نے ساری رات گذار دی۔ یکایک مرغ نے آواز دی اور آسمان پر سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا۔

تھریس کے ایک شہر آبدیرا میں ایک دولت مند آدمی رہتا تھا اس کا نام داماسی پس تھا۔ اس کا ایک لڑکا تھا۔ اس کا نام دیموکرٹس تھا۔

ایک دفعہ اس دولت مند یونانی کے گھر میں ایک ایرانی بادشاہ دارا گستر آ کے مہمان ٹھہرا۔ اس کے ساتھ اس کے اپنے ملک کے بہت سے ایرانی عالم و فاضل تھے، جب بادشاہ داماسی پس کے گھر سے رخصت ہوا تو اپنے میزبان کی استدعا پر اپنے کئی ایک عالم داداسی پس کے لڑکوں کو پڑھانے کے لئے چھوڑ گیا۔

یہ ایرانی اپنے ساتھ بہت سے ہندوستانی مفکروں کا علم و تجربہ لائے تھے۔ دیموکرٹس نے ان سے سیکھا کہ دُنیا باریک نقطوں سے بنی ہے۔ نقطوں سے تم ایک لکیر بنا سکتے ہو۔ لکیروں سے سطحیں۔ سطحوں سے

مکعب بنتے ہیں، ٹھوس مادے سے معمور دنیا۔ ایسی بہت سی دنیائیں آسمان میں ہیں۔ جنھیں ہم لوگ ستارے کہتے ہیں۔ یہ آگ کی مشعلیں نہیں ہیں مادّے کی گولائیاں ہیں۔

داماسی پس کی وفات کے بعد اس کی ساری جائداد دیموکریٹس کے حصّے میں آئی۔ آبدیرا کے لوگوں نے باتفاق رائے دیموکریٹس کو اپنے شہر کا چیف مجسٹریٹ چن لیا۔ ڈیموکریٹس کے سامنے اب ایک مطمئن فارغ البالی، چین اور سکون کی زندگی تھی۔

لیکن دیموکریٹس چین اور سکون کی زندگی بسر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ علم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنی ساری جائداد بیچ دی اور علم حاصل کرنے کے لئے ایران اور مصر کی درسگاہوں کی طرف روانہ ہوگیا۔

کئی سالوں کے بعد جب دیموکریٹس اپنے گھر لوٹا تو اس کے اپنے باپ کی دولت میں سے ایک کوڑی نہ بچی تھی۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک کتاب تھی۔ "ہمارا عظیم کائناتی نظام"۔

آبدیرا کے لوگ اس سے بیحد خفا ہوگئے۔ وہ اسے پکڑ کے شہر کی سب سے بڑی عدالت کے سامنے لے گئے۔ اور اس پر الزام لگایا کہ ڈیموکریٹس نے اپنے ماں باپ کی ساری دولت کو تباہ و برباد کردیا ہے۔ اس لئے اسے قرار واقعی سزا دی جائے۔

جب عدالت نے اس سے صفائی طلب کی تو ڈیموکرٹس نے اپنی گواہی میں کسی گواہ کو پیش نہیں کیا۔ اس نے اپنی کتاب کے اوراق پلٹے اور پڑھنے لگا۔

پہلے پہل تو عدالت نے اور تماشائیوں نے سمجھا شاید ڈیموکرٹس پاگل ہوگیا ہے۔ لیکن جوں جوں ڈیموکرٹس اپنی کتاب کے اوراق اُلٹتا گیا اور پڑھتا گیا ساری عدالت میں ایک سنّاٹا چھا گیا اور جج اور جیوری اور مدعی اور تماشائی مسحور ہو کے اک نئے آسمان کو اپنے سامنے کھلتا ہوا دیکھنے لگے تھے۔

ڈیموکرٹس نے کہا یہ دنیا ایک لٹّو کی طرح گھوم رہی ہے۔ یہ چپٹی نہیں ہے، اور سلنڈر کا حصّہ بھی نہیں ہے۔ یہ دُنیا ایک لٹّو ہے گردش سے ذرات گرم ہو کے فضا میں اڑتے ہیں اور ایک دوسرے سے مل کر نئی دُنیائیں بناتے ہیں۔ آسمان میں ان گنت دُنیائیں ہیں اور کوئی ایک دوسرے سے ملتی نہیں ہے۔ جس طرح دو آدمیوں کے چہرے ایک دوسرے سے لگّا نہیں کھاتے، اسی طرح دو دنیائیں بھی ایک دوسرے سے الگ صورت رکھتی ہیں۔ اس آسمان پہ ایک سورج اور ایک چاند نہیں ہے۔ بہت سے سورج اور بہت سے چاند ہیں۔ کچھ دنیائیں روشن ہیں کچھ تاریک ہیں۔ وہاں کوئی سورج اور کوئی چاند

نہیں ہے اور پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے۔ وہاں مکمل خاموشی ہے اور موت کا سا سکون ہے۔

یہ گردش کرتی ہوئی دنیا میں کبھی ایک دوسرے سے ٹکرا جاتی ہیں۔ فتح بڑی دنیاؤں کی ہوتی ہے۔ چھوٹی دنیا میں ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتی ہیں۔ مگر ان ٹکڑوں سے پھر اک نئی دنیا تعمیر ہوتی ہے۔ نئے سورج اور نئی زمینیں پیدا ہوتی ہیں۔ آسمان بے کنار ہے۔ اس کی کوکھ ابھی بے کنار نہیں ہوئی ہے۔ وہ ابھی تک نئے ستاروں کو جنم دیتی ہے۔

اس بے کنار آسمان کا ہر ذرہ ایک محدود، بہت ہی مختصر سے مختصر ذرّے سے بنا ہے۔ اس ذرے کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ اس ذرے کا نام ایٹم ہے۔

جب ڈیموکرٹس عدالت کے سامنے بیان دے رہا تھا تو لوگوں کے دلوں میں زمین اور آسمان کا ایک نیا رشتہ ابھر رہا تھا۔ یہ رشتہ جو پہلے رشتوں سے کہیں خوبصورت تھا۔ اب زمین آسمان کا ایک حصہ تھی۔ ہم زمین والے آسمان والے بن گئے تھے۔ فلک کا گلہ کرنے والے خود ہی ستم کوش تھے۔ چرخِ ناہنجار کو گالیاں دینے والے گویا اپنے گھر کو کوس رہے تھے۔ آج زمین اور آسمان نے ہاتھ ملائے تھے۔ یہ زمین اور آسمان جو ایک دوسرے سے کتنے دور تھے، کس طرح

ایک دوسرے کے اس قدر نزدیک ہو گئے تھے۔ اس میں ڈیموکریٹس کا ہاتھ تھا۔ اور اناکسی گوراسی کا اور ایران کے مفکروں کا اور ہندوستان کے رشیوں کا اور بابل کے عالموں کا اور مصر کے دانشوروں کا دنیا کے مختلف کونوں سے انسان نے اپنا ہاتھ اٹھا کے اپنے علم و دانش سے آسمان کی تعمیر کی تھی۔

لیکن ڈیموکریٹس کی سچائی آخری سچائی نہیں تھی۔ کوئی سچائی آخری سچائی نہیں ہوتی۔ جب کہ وہ کہہ رہا تھا کہ ایٹم کو کوئی نہیں توڑ سکتا، اس وقت اسے کیا معلوم تھا ایک دن انسان اس ذرے کو بھی توڑ کے رکھ دے گا۔ اور اس وقت انسان کے ہاتھ میں سورج کی توانائی آجائے گی جس سے وہ اس دنیا پر بہشت بھی بنا سکے گا۔ اور دوزخ بھی اور یہ فیصلہ آسمان نہیں کرے گا اس کی تقدیر نہیں کرے گی۔ یہ اس کی عقل و دانش کا فیصلہ ہوگا کہ وہ کیا بنائے گا۔ بہشت یا دوزخ ؟

ڈیموکریٹس نے کتاب ختم کر دی۔ عدالت نے اسے بری کر دیا۔ بلکہ اسے پانچسو اشرفیاں انعام میں دیں۔ اس کے اعزاز میں اس کے اپنے شہر میں اس کی زندگی میں ایک جست کا بت نصب کرانے کا حکم دیا۔

ڈیموکریٹس ان پانچسو اشرفیوں کو لے کر پھر سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہ آسمان ساز تھا وہ ایک جگہ پر کیسے رک سکتا تھا۔ گھومتے گھومتے وہ ایتھنز پہنچا

یہاں اس کی ملاقات اناکسی گوراسی سے ہوئی۔ ایک آسمان ساز دوسرے آسمان ساز سے ملا۔ مگر اناکسی گوراسی کو ڈیموکریٹس کے خیالات بہت زیادہ جسارت آمیز معلوم ہوئے۔ ایتھنز میں اس وقت سقراط بھی تھا۔ مگر سقراط سقراط تھا۔ وہ ڈیموکریٹس کو کیا سمجھتا۔

ارسطو کے ایک سو سال بعد الگزینڈریہ کے عجائب گھر میں۔

مصریوں کے اس شہر میں مصری اور یونانی تہذیبیں گنگا جمنا کی طرح آکے ملی تھیں۔ مصری فرعونوں کو شروع ہی سے علم وتہذیب سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ لوگ شاعروں، فلاسفروں اور سائنسدانوں کو خاص کر علمِ ریاضی کے ماہروں اور میکینکس جاننے والوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔

ماقبل تیسری صدی عیسوی میں الگزینڈریہ میں یونانی اور مصری علم و فضل کے باہمی اشتراک سے ایک خوبصورت مندر بنایا گیا۔ اس سے پہلے مندر خداؤں کے لئے بنائے جاتے تھے۔ مگر یہ مندر بالکل نیا تھا۔ یہ مندر سائنس کی دیوی کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس مندر میں بتوں کے بجائے لیبارٹریاں نصب کی گئیں۔ علم وفن سکھانے کے لئے الگ الگ شعبے مقرر کئے گئے۔ جیومیٹری کا استاد یوکلڈ تھا۔ ارشمیدیس میکینکس پڑھاتا تھا۔ بڑے بڑے بادشاہ اس مندر میں پڑھنے کے لئے آتے تھے۔

دُور دُور کے ملکوں سے ہزاروں طالب علم کئی سال کی مسافت کے بعد الگزینڈریہ کے مندر میں علم حاصل کرنے کے لئے پہنچتے تھے۔ الگزینڈریہ کے عجائب گھر میں لائبریری بہت بڑی تھی۔ اس لائبریری میں ڈیموکریٹس کی کتابیں بھی موجود تھیں۔ مگر کوئی انھیں پڑھتا نہ تھا۔ انہیں دیمک چاٹ رہی تھی۔

چوتھی صدی عیسوی میں ارسطو نے ایتھنز میں لائسیم قائم کیا۔ لائسیم کی درسگاہ میں ایک طالب علم تھا تھیوفراسطو۔ ارسطو نے تھیوفراسطو کو پڑھایا۔ تھیوفراسطو نے سطراطو کو۔ سطراطو نے ارسطارخس لائسیم سے تعلیم پاکر الگزینڈریہ چلا گیا۔ وہ ڈیموکریٹس کے حامیوں میں سے تھا۔

ارسطارخس نے فلکیات کا مطالعہ شروع کیا۔ آسمان سے اسے بڑی دلچسپی تھی۔ آسمان گویا اس کا گھر تھا۔ وہ دن رات آسمان کا نقشہ بنانے میں مصروف رہتا اس کے اوزار بڑے ناقص اور بھدے تھے مگر انہی اوزاروں کی مدد سے اس نے انسان کے لئے آسمان کا ایک نیا نقشہ تیار کیا۔ اس نے زمین سے چاند کا فاصلہ ناپا اور تقریباً تقریباً ٹھیک ناپا۔ اس نے سورج سے زمین کا فاصلہ ناپنے کی کوشش بھی کی۔

جوں جوں وہ آسمان کا مطالعہ کرتا جاتا اسے معلوم ہوتا جاتا کہ زمین آسمان کا

مرکز نہیں ہے جیسا کہ اب تک بہت سے سائنسدان سمجھتے آئے تھے مرکز سورج ہے، وہ زمین کے گرد گردش نہیں کر رہا ہے بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔

اس دریافت سے یکایک آسمان کے بہت سے تاریک کونے روشن ہو گئے فلکیات کے حساب کی بہت سی غلط باتیں خود بخود درست ہو گئیں۔ پرانے آسمان کا ایک بوسیدہ کنگرہ ٹوٹ کے گر پڑا۔ اور اس کی جگہ ایک ایسے نظام شمسی نے لے لی، جس کا مرکز سورج تھا۔ جس کے گرد زمین ایک سیارے کی طرح رقص کر رہی تھی۔ اس سے پہلے زمین ایک عشوہ طراز محبوب کی طرح اپنے چاروں طرف دیکھتی تھی۔ لیکن آج وہ محبوب نہ تھی۔ عاشق بن گئی تھی۔ انسان نے پہلی بار اپنے آپ کو عاشق کی طرح دیکھا۔ اور فخر اور مسرت اور غرور سے اس کا سینہ تن گیا۔

آج سے کئی صدیاں پہلے جب مغرب نے آسمان سازوں پر اپنے دروازے بند کر لئے تو بغداد نے انہیں پناہ دی۔ بغداد حسین چہروں، حرم سراؤں اور الف لیلوی حکایتوں کا ہی شہر نہیں رہا ہے۔ اس شہر نے اپنے نازک منقش میناروں سے آسمان کو بھی تاکا ہے اور اس کی پہنائیوں میں اپنے علم و فن کے نشان چھوڑے ہیں۔ اپنی عظمت کے دور میں بغداد

کی گلیاں کتابوں کی دوکانوں سے پٹی پڑی تھیں۔ یہاں پر لوگوں کو یونانی مفکروں کی کتابوں کے ساتھ ہندوستانی سائنس دانوں کی کتابیں بھی ملتی تھیں۔ شفاخانوں میں ہندوستانی ویداور جراح بھی کام کرتے تھے۔ درسگاہوں میں مصری فنکار علم وفضل کے خزانے لٹا۔تے تھے۔

گیارھویں صدی عیسوی میں خلافت کے بٹ جانے کے بعد بھی اسلامی دنیا میں کاردووا سے بخارا تک اور بغداد سے اُرگنج تک سائنس دانوں کی عزت ہوتی تھی۔ انہیں خلعتیں عطا کی جاتی تھیں اور زروجواہر سے ان کی جھولیاں بھردی جاتی تھیں۔

ایک بار خلیفہ ہارون رشید نے کہا "میں ایک عالم کی سیاہی کی اتنی ہی قدر کرتا ہوں جتنی ایک شہید کے خون کی"۔ اس زمانے نے البیرونی ایسا آسمان ساز پیدا کیا، جس نے اپنے علم وفضل کے تجربے کی بنا پر اعدادوشمار سے ثابت کیا کہ زمین کے سورج کے گرد گھومنے سے ستاروں کی اضافی نقل وحرکت میں کوئی غلطی نہیں پیدا ہوتی۔ یہ غلطی جو سائنسدان اب تک اپنے حساب میں دکھاتے آئے ہیں، البیرونی نے یہ بات کوپرنکس سے بہت پہلے معلوم کی تھی۔

اسی زمانے میں الحسن نے ثابت کیا کہ جب سورج مغرب میں ڈوب جاتا ہے تو اس وقت بھی اس کی شعاعیں ہمیں نظر آتی رہتی ہیں جب تک آفتاب

مغرب کے وقت اُفق سے باون ہزار قدم نیچے نہیں اتر جاتا۔ اس وقت تک ہمیں اس کی شعاعیں نظر آتی رہتی ہیں۔

آج بیسویں صدی کے ماہر فلکیات جب اس سلسلے میں حساب لگاتے ہیں تو وہ الحسن کی دریافت سے بہت دُور نہیں جا سکتے۔

طیلس، اناکسی مینڈر، ڈیموکریٹس، البیرونی، الحسن، کوپرنیکس، گیلیلیو، آسمان کی تعمیر کا کام جاری ہے۔

بچّے نے بڑے غور سے میری کہانی سُنی۔ کچھ سُنی ہے کچھ نہیں سُنی ہے کچھ سمجھی ہے کچھ نہیں سمجھی ہے۔ یہ کہانی جو بہت سی کتابوں، بہت سی بحثوں، بہت سے تجربوں کے بعد مجھ تک پہنچی ہے۔ وہ بڑے غور سے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ کیا وہ فٹن کی طرح سورج کے رتھ میں سوار ہونا چاہتا ہے؟

میں جانتا ہوں کہ وہ آسمان کی طرف جائے گا۔ گلابی انگلیوں والی سحر اسے اپنے پاس بلا رہی ہے۔ مشرق کے دروازے کھل گئے ہیں۔ اور چار گھوڑوں والا رتھ اس کی سواری کے لئے کھڑا ہے۔ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ اب وہ فٹن کی سی غلطی نہیں کرے گا۔ اس کے پاس بہت سے آسمان سازوں کا تجربہ ہے۔ آج انسان نے ایٹم کا جگر چیرا

ہے۔ اور بڑے حوصلے سے نظام شمسی کی طنابیں اپنے ہاتھ میں لی ہیں۔
آج وہ پھر ایک نیا آسمان بنانے پر تل گیا ہے۔ کیونکہ جو انسان اپنی زمین سے مطمئن نہیں ہے، وہ اپنے آسمان سے کیا مطمئن ہوگا۔ جب تک وہ کہکشاں کی وسعتوں کو پھاند کر آسمان میں ایک نیا تاج محل نہیں بنائے گا اسے چین نہیں آئے گا۔ کیونکہ انسان صرف خاک کا پتلا ہی نہیں، وہ سورج کا بیٹا بھی ہے۔

محراب

باب

گرانٹ روڈ اسٹیشن کی طرف دیوار سے لگی ٹاٹ کی دیواریں اور لکڑی کی کھپچیوں کے بدنما ڈھانچوں پر استادہ بیسیوں چھوٹی چھوٹی دوکانیں نظر آتی ہیں۔ یہاں دو آنے کا مال ایک آنے میں ملتا ہے اور ایک آنے کا مال دو پیسے میں ملتا ہے۔ یہاں امریکی بلیڈ، جاپانی کلپ، انگریزی صابن، فرانسیسی تیل اور ہندوستانی غریبی بکتی ہے۔ پھل والے عراق کی کھجور، لبنان کے انجیر قندھار کے انگور اور آسٹریلیا کے سیب بیچتے ہیں۔ ایرانی ریسٹوراں والے امریکی ٹافیاں، انگریزی سگرٹ کینیڈین مربہ اور ڈچ دودھ بیچتے ہیں۔ پرانی کتابوں اور رسالوں کی جو دوکانیں ہیں ان پر صرف امریکی ناول اور رسالے نظر آتے ہیں۔ ہر رسالے اور کتاب کے باہر ایک خوبصورت عورت کی نیم عریاں تصویر ہوتی ہے جو کتاب کے اندر جاکر بالکل عریاں ہو جاتی ہے اور یہی اس کتاب کا موضوع ہو جاتا ہے۔

ان چھوٹی چھوٹی دوکانوں کے بیچ میں جو تنگ سی سڑک باقی رہ گئی ہے، اس پر چند دوکاندار کھلے چھاتوں کو الٹا لٹکائے ان کے سیاہ گھیروں میں

ولائتی رومال، موزے، لپ اسٹک اور ٹائیاں لئے گھوم رہے ہیں۔ اور گلے سے عجیب عجیب آوازیں نکال کر گاہکوں کو اپنے مال کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ یہاں ہر بکنے والی چیز ولائتی ہے کوئی چیز دیسی نہیں۔ اگر ہے تو بھی نہیں ہے بلکہ بلیک مارکیٹ میں چلی گئی ہے، کیونکہ دیسی سرمایہ دار جو چیز بھی تیار کرتے ہیں وہ صرف کالے بازار میں بیچنے کے لئے ہوتی ہے، اور تیار ہوتے ہی اپنے مقام پر چلی جاتی ہے۔ چنانچہ کپڑے والے کی دوکان پر آپ کو انگریزی ٹول، جاپانی کریپ، فرانسیسی ستان اور بلجیم کی آرگنڈی تو مل جائے گی، لیکن دیسی کپڑا کسی قیمت پر نہیں ملے گا۔ اس وقت گرانٹ روڈ کے کھلے بازار میں صرف دو دیسی چیزیں نظر آتی ہیں۔ ایک پان، دوسرے پھول۔ اور یہ بھی اگر کسی طرح قدرت کے کارخانے میں تیار ہونے کے بجائے دیسی سرمایہ داروں کے کارخانے میں تیار ہوتے تو کب کے بلیک مارکیٹ میں پہنچ گئے ہوتے۔ ہاں ایک تیسری چیز بھی ہے جو بازار میں کھلے بندوں بک رہی ہے۔ یہ ہندوستانی بلیڈ ہیں۔ ان کی قیمت جلیٹ سے دگنی ہے۔ اور یہ انسانوں کے بجائے گھوڑوں کے بال صاف کرنے کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں ایک دوکان پر مراداباد کے نایاب برتن بھی ملتے ہیں۔ لیکن ان کی قیمت اس قدر زیادہ ہے کہ انھیں کوئی ایماندار آدمی چاہے وہ کسی ملک کا

باشندہ ہو نہیں خرید سکتا۔ یہ برتن صرف امریکی ٹورسٹوں کے لئے ہیں جس جگہ مراد آبادی برتنوں کی چھوٹی سی دوکان ہے، اس کے ساتھ ہی لگی ہوئی سداشو پھول والے کی دوکان ہے اور جس جگہ سداشو پھول والے کی دوکان ہے وہاں سے گرانٹ روڈ پل کی محراب شروع ہوتی ہے۔ اس کے اندر طرف تو یہ گرانٹ روڈ کا تنگ اور پُر شور بازار ہے اور دوسری طرف جیٹن جی پسٹن جی والا کا پارسی محلّہ ہے، جہاں ہر دم ایک گہرا سنّاٹا چھایا رہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس محلے کا ہر مکان اپنا سانس روکے دم بخود کھڑا ہے۔ گھروں کے باہر کھریا مٹی کے خاموش نشان ہیں۔ سڑک کے کنارے دھوپ میں آئی ہوئی موٹریں بڈھے پنشن خوروں کی طرح سر جھکائے اُونگھ رہی ہیں۔ سیڑھیوں کے کونوں پر لاغر کتّے دبکے ہوئے ہیں اور اوپر بالکنی میں پتلی پتلی باہوں والی زرد رنگ کی پارسی عورتیں مٹّی کے لٹکے ہوئے گملوں کے پھول دار پودوں کو پانی دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ پژمردہ پھول۔ پژمردہ عورتیں۔ سوئے ہوئے کتّے۔ گلی سڑی ترکاری کی عجیب سی بو اس سنّاٹے کو اور بھی گہرا کر دیتی ہے۔ ایک طرف مسلسل شور ہے دوسری طرف ایک دم سنّاٹا۔ اور بیچ میں یہ تنگ و تاریک محراب کھڑی ہے۔ جیسے آواز اور خاموشی نے ہاتھ بڑھا کر سمجھوتہ کر لیا ہو۔ اکثر آدمی محراب کے

اِدھر اُدھر جاتے ہوئے یا اُدھر سے اِدھر آتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے سکتہ میں رہ جاتے ہیں اور انھیں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ پُر شور زندگی میں آ نگھسے ہوں اور درمیان میں یہ محراب ہے جس کے سینے پر اَن گنت قدموں کے نشان ہیں۔ جہاں دن رات سینکڑوں ٹرینیں بسیں گاڑیاں اور موٹریں، دندناتی پھرتی ہیں۔ جہاں ہر چند منٹ کے بعد گرانٹ روڈ اسٹیشن کی لائنوں پر بھاگتی ہوئی گاڑیوں کی دھمک محسوس ہوتی ہے۔ اور پھر جیسے گاڑی کے گذرنے تک محراب کی پرانی اینٹیں کسی بھونچال سے کانپنے لگتی ہیں۔ اور چھت سے مٹی گرنے لگتی ہے۔ پھر گاڑی گذر جاتی ہے اور چند لمحوں کے لیے پھر سناٹا چھا جاتا ہے اور پھر اس سناٹے میں سدا شو پکار اُٹھتا ہے۔

"پھول لے لو۔ گلاب کی سندر دین"

یہ محراب بہت پرانی دکھائی دیتی ہے اور محراب کی چھت کے اوپر ٹرام کی سڑک ہے۔ اس لئے اس کی تو مرمت ہوتی رہتی ہے۔ لیکن محراب کے نیچے کی مرمت ہوتے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ اندر سے پلستر جگہ جگہ سے اُدھڑ گیا ہے اور جہاں پلستر باقی ہے وہ میل سے اور چکناہٹ سے اور راہگیروں کے ہاتھوں کی برابر رگڑ سے اس قدر چمک اُٹھا ہے کہ آدمی اس میں سے بخوبی اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔

جہاں پلستر نہیں ہے وہاں کی تمام سرخ اینٹیں اب سیاہ پڑ گئی ہیں
اور ان میں کیلیں ٹھونک کر سداشو کی بیوی پاربتی نے کپڑے سکھانے
کے لئے الگنی ڈال دی ہے اور اس کے اوپر وہ تصویر لگادی ہے جس
میں دشنو بیچ سمندر میں سانپ کی کنڈلی پر لیٹے ہوئے آرام کر رہے
ہیں ۔ اور ان کی ناف سے لکشمی کنول کے پھول کی طرح نکل رہی ہے
پاربتی ہر روز صبح اٹھتے ہی اس تصویر کے درشن کرتی ہے کیونکہ
جن لوگوں کو لکشمی سچ مچ نہیں ملتی وہ اس کی تصویر ہی کو دیکھ کر خوش
ہو لیتے ہیں ۔ اس کے بعد وہ پیتل کی گھاگھر اٹھا کر محراب کے پچھواڑے
لوہے کے جنگلے میں سے گذر کر رستم جی مستری کے بنگلے میں پانی لینے
کے لئے جاتی ہے ۔ اس بنگلے میں پانی لانے کا طریقہ بھی عجیب ہے ۔
اس بنگلے میں ایک چھوٹا سا باغیچہ ہے ۔ جس میں پودوں اور بیلوں کو
پانی دینے کے لئے ایک نل لگا ہوا ہے ۔ یہ نل رستم جی مستری کے پرانے
اور بوڑھے مالی رحیمو کاکا کے قبضے میں ہے ۔ باغیچہ کے ارد گرد اور
خاص طور سے محراب کی طرف لوہے کا ایک مضبوط ڈنڈا لگا ہوا ہے
جس کی ایک پٹڑی رحیمو کاکا نے ہلا ہلا کر ڈھیلی کر دی ہے ۔ وہ
صبح سے پہلے ہی اس پٹڑی پر آن کھڑا ہوتا ہے ۔ اور پانی بھرنے
والوں سے دو آنہ فی گھڑا دھر لیتا ہے ۔ اس کے بعد وہ پٹڑی کو اپنی

جگہ سے ہٹا دیتا ہے۔ اور پانی بھرنے والے نل سے پانی بھر لیتے ہیں۔ اور جنگلے سے باہر چلے جاتے ہیں۔ یہ بنگلہ چونکہ بالکل ریلوے لائن پر واقع ہے، اس لئے رفع حاجت کے لئے بھی اس بنگلے میں سے ہو کر جانا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ محراب کے نیچے رہنے والے اور سڑکوں پر سونے والے رفع حاجت کے لئے ریلوے لائن کے سوا اور کہاں جا سکتے ہیں۔ اسٹیشن پر جائیں تو پلیٹ فارم کا ٹکٹ دو آنے کا ہوتا ہے اور بھنگی ایک آنہ الگ جھاڑ لیتا ہے۔ اور یہاں کھانے کے لئے تو تین آنے ملتے نہیں، رفع حاجت کے لئے تین آنے کہاں سے لائیں گے۔ اور ابھی نہ جانے کتنی مدت جینا ہے۔ زندگی کتنی دور تک اداس چلی گئی ہے۔ ایک ریلوے لائن جس کے کنارے کنارے کوڑے کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ بھلا ہو رحیمو کاکا کا کہ وہ اس کام کے لئے جنگلہ سے گزرنے کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں لیتا۔ اسے صرف چلا کر کہنا پڑتا ہے۔

رحیمو کاکا برلا ہاؤس جانا ہے۔

اور وہ سمجھ جاتا ہے اور مسکراتے ہوئے اپنی سفید ڈاڑھی ہلاتا ہوا آتا ہے اور جنگلہ کی لوہے کی پٹڑی کھول کر ریلوے لائن پر جانے کا راستہ دے دیتا ہے۔

اس خالی محراب کے نیچے بہت سے لوگ رہتے ہیں۔ اور کیوں نہ رہتے بمبئی میں اس سے اچھی، بہتر، کشادہ اور آرام دہ جگہ کہاں ملے گی۔ نیچے کا فرش پکا ہے جو کنکریٹ سے تیار کیا گیا ہے۔ محراب کی دیواریں بھی موٹی اور مضبوط ہیں اور چھت ہزاروں ٹن بوجھ روزانہ اٹھاتی ہے ایسی مضبوطی کسی گھر میں کیا ملے گی۔ اور ایسی کتنی ہی سرکاری محرابیں بمبئی میں موجود ہیں۔ پلوں کی محرابیں۔ عمارتوں کے تاریک کونے، سرکاری باغیچوں کے نیچے سیمنٹ کے صاف ستھرے فٹ پاتھ۔ جن پر بمبئی کی نصف آبادی سوتی ہے اور ایک پائی کرایہ نہیں دیتی۔ سرکار کی فراخدلی کی حد ہوگئی ہے۔ ملک لٹا جا رہا ہے۔ فوجی اخراجات بڑھتے جا رہے ہیں۔ سرمایہ داروں کا نقصان پر نقصان ہو رہا ہے۔ اور اوپر سے شراب اور رمی بھی بند ہوگئی ہے اور سُنتا ہے کہ رنڈی بازی بھی بند ہونے والی تھی۔ مگر بھلا ہو کانگریسی ممبروں کا جنھوں نے واویلا مچا کر اسے رکوا دیا ہے۔ اور اپنی سرکار ہے کہ بمبئی کے ان لاکھوں مفت خوروں سے ایک پائی بھی کرایہ وصول نہیں کرتی۔ اگر سرکار بمبئی اور کلکتہ اور دلّی اور دوسرے چھوٹے بڑے شہروں کے پلوں کی محرابیں اور فٹ پاتھ پر رہنے والے اور سرکاری باغیچوں کے بنچوں پر سونے والوں سے ایک روپیہ ماہوار کرایہ بھی وصول کرے تو ہر سال سرکاری خزانے

میں کروڑوں روپیہ جا سکتا ہے۔ اور ہندوستان کی عزت امریکہ میں اور برطانیہ اور آسٹریلیا اور برٹش ہانڈ وراس میں بہت بڑھ سکتی ہے۔ اور اس وقت ہندوستان کے سامنے سب سے بڑا سوال روٹی۔ پانی کپڑے کا نہیں ہے۔ سوال عزّت کا ہے۔

اس خالی محراب کے نیچے جو لوگ رہتے ہیں وہ بھی سرکار کو اس کا کوئی کرایہ ادا نہیں کرتے۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو رات کو رہتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو دن رات دونوں وقت رہتے ہیں۔ جیسے وہ اندھا اور لنگڑا بھکاری جو گدڑی پر سمٹا ہوا محراب کے مغربی کونے پر آدھا اندر اور آدھا باہر پڑا رہتا ہے اور ایک ایک آنہ کے لئے چلاتا رہتا ہے۔ جو لوگ بمبئی میں باہر سے آتے ہیں انھیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ بمبئی میں بھکاری ایک یا دو پیسے نہیں مانگتا بلکہ ایک آنے سے کم کی بات نہیں کرتا۔ اتنا ہی نہیں جو اچھے بھکاری ہیں وہ دو آنے سے کم نہیں لیتے۔ اور صاف کہہ دیتے ہیں جا بابا تجھے معاف کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بمبئی میں روٹی دو آنے کی ہوتی ہے اور اس لئے گویا جو دو آنے کا سوال ہے وہ ایک روٹی کا سوال ہے اور روٹی کے ساتھ جو سالن چاہیے اس کے لئے الگ آنے چاہئیں۔ پھر حمیو کا کا بھی دو آنے پانی کے لئے لیتا ہے۔

اور ہر آدمی کو پانی چاہیئے۔ چاہے وہ بھکاری ہی کیوں نہ ہو۔ پانی کے بغیر آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔ نہانے کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے، جیسے یہ اندھا بھکاری برسوں سے نہائے بغیر زندہ ہے اور برسوں سے چارپائی پر سوئے بغیر زندہ ہے۔ انسان کیسی کیسی حالتوں میں مرتا ہے۔ اس کی اتنی حیرت نہیں۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ کیسی کیسی حالتوں میں زندہ رہ جاتا ہے اور موت کا مقابلہ کرتا ہے۔

یہ اندھا بھکاری تو رات دن یہیں پڑا رہتا ہے۔ لیکن کھلونے والا صرف رات کو یہاں آکر سوتا ہے۔ کھلونے والا اندھے کے بالکل سامنے محراب کی دوسری دیوار سے بالکل لگ کر سوتا ہے۔ اور وہ بھی محراب کے آدھا اندر آدھا باہر سوتا ہے۔ اس کے سونے کے لئے جگہ تو کافی ملتی ہے لیکن اسے اپنے کھلونوں کی ٹوکری بھی رکھنا ہوتی ہے جو اس کی روزی ہے اور اس کی محنت ہے اور اس کی پونجی ہے اور اس کا آج ہے۔ اور اس کا کل ہے اور پرسوں ہے جو اس کے پاؤں کی تھکن ہے اور گلے کی رکتی ہوئی آواز ہے۔ اور دل کی ڈوبتی ہوئی گشتی ہے اور جسے لئے ہوئے وہ ہر روز بمبئی کی گلیوں میں سے جاتا ہے اور سمندر کے کنارے چکر لگا کر آجاتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ بچے کیا ہوئے جو ریت کے گھونگھے تلاش کرتے ہوئے شور مچاتے تھے۔ ان بچوں کی

تعداد کیوں روز بروز کم ہوتی جارہی ہے جن کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔
آنکھوں میں بے فکری تھی اور سر پہ ماستا کا سایہ تھا۔ آج کیوں ہر گلی
میں مائیں اداس کھڑی ہیں۔ بچے چپ ہیں اور کھلونے یتیم ہو گئے ہیں
اور سب سوچ سوچ کر بھی اسے اس بات کا جواب نہیں ملتا تو پھر وہ
اپنی اس بے سُری آواز میں چلّا اُٹھتا ہے۔ کھلونے لے لو۔ کھلونے لے
لو۔ اور کوئی اس کے کھلونے نہیں لیتا۔ اور گورے گورے گالوں والی
بڑھیا اور سبز رنگ کا مینڈک اور ڈھول کی طرح بجنے والی ڈگ ڈگیاں اور
چیں چیں کرنے والا دتار۔ اور چڑیا کی طرح چہکنے والی سیٹی۔ اس کی
ٹوکری سے سر نکالے بچوں کی طرح حیرت سے چاروں طرف دیکھتی
اور پریشان ہوتی کہ دنیا دن بدن ویران کیوں ہوتی جارہی ہے۔
ہم کب سے اس ٹوکری میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ ہمیں اس قید خانہ
سے نجات دو۔ ہمیں بچوں سے کھیلنے دو۔ لیکن بہت کم ایسا ہوتا ہے
کھلونے بہت کم بکتے ہیں اور ہر روز تھکا ماندہ کھلونے والا رات گئے
محراب میں واپس آتا ہے اور کھلونے کی ٹوکری سرہانے رکھ کر سو جاتا
ہے۔ جگہ کم ہے کیونکہ اسے ٹوکری کو بھی رکھنا ہوتا ہے۔ اس لئے
اس کا آدھے سے زیادہ جسم محراب کے باہر ہوتا ہے۔ وہی ٹانگیں
جو دن بھر بوجھ اُٹھائے رہتی ہیں رات کو اوس کی سردی برداشت

کرتی ہیں۔ اس لئے دن بھر دکھتی رہتی ہیں اور تھکے ہوئے اعضا ہر دم یوں جھنجھناتے رہتے ہیں جیسے کہ اندر بھی کوئی مٹی کا کھلونا بار بار چیں چیں کر کے شور مچا رہا ہو!

کھلونے والے کے ذرا آگے محراب کے اندر اعظم سوتا ہے۔ اعظم سے آگے اس کی ماں۔ بی۔ بی سوتی ہے۔ پچھلے تیس سال سے وہ راج گیر ل کے کپڑے کھاتے میں مزدوری کر رہی ہے۔ اس کے بال کھچڑی کی طرح پک گئے ہیں اور اس کی آنکھوں کے ارد گرد جھریوں کا باریک سا جال زمانہ بنتا جا رہا ہے۔ کبھی یہ چمڑی بالکل صاف اور روشن تھی۔ کبھی ان آنکھوں میں کاجل تھا اور ہونٹوں پر ایسی پیاری لبھاؤنی مسکراہٹ تھی کہ اس کا کھیت مزدوری کرنے والا آدمی دن بھر کا تھکا ہارا اپنی ساری کوفت اور تکان بھول جاتا تھا۔ اور بڑے پیار سے گلے لگا لیتا تھا۔

بی بی کے خاوند نے آہستہ آہستہ اپنی زندگی کھوئی تھی۔ پہلے تو کھیت مزدوری نے اس کا کچومر نکال دیا۔ کھیت مزدوری کے ساتھ دن میں ایک دفعہ فاقہ تو ضرور ہوتا تھا۔ اسی مزدوری میں ڈالیاں بھی ہوتی تھیں۔ بیگار بھی ہوتی تھی۔ کوڑے بھی پڑتے تھے اور جب زمیندار کی نظر گھر کی عزت پر پڑتی تھی تو گھر کی عزت بھی جاتی تھی۔ اس عزت کو

بچانے کے لئے بی بی کے خاوند نے کھیت مزدوری چھوڑ دی اور بی بی کو لے کر کانپور آگیا۔

پہلے وہ پھونس کی جھونپڑی میں رہتا تھا۔ پھر وہ ٹاٹ کے پردے کی آڑ میں رہنے لگا۔ اور پھر چمڑے کے کارخانے میں کام کرتے کرتے اس کی زندگی پکائے ہوئے چمڑے کی طرح بے رس اور سخت ہوتی گئی۔ اور بی بی کی آنکھوں سے کاجل اور ماتھے سے روشنی چھوٹتی گئی اور بی بی کا خاوند مر گیا تو بی بی کی آنکھوں کے گرد جھریوں کی پہلی لکیر دکھائی دی۔ اور وہ اپنی بچی کو لے کر بمبئی آگئی۔ یہاں وہ راج گیرل کے کپڑے کھاتے میں نوکر ہو گئی اسے مردوں کی آدھی تنخواہ ملتی تھی، گو وہ کام مردوں کے برابر کرتی تھی۔ مگر بی بی نے ہمت نہ ہاری۔ اس کے ہونٹ اندر سکڑتے جا رہے تھے۔ جیسے وہ کسی دوسرے پر نہیں اپنے آپ پر جبر کر رہی ہو۔ دن رات ایک ایک پیسہ بچا کر اس نے اپنے بیٹے اعظم کو دسویں درجہ تک پڑھا دیا تھا اور جب روزنا اعظم نے دس درجے پاس کر لئے اور اخبار میں اس کا اول نمبر نکلا تو وہ بڑے چاؤ اور پیار سے اخبار کے اس ورق پر اپنی کانپتی ہوئی انگلیاں پھیرنے لگی، جیسے اخبار کا وہ ورق ریشم کے کپڑے سے بھی زیادہ ملائم ہو۔

آج تیس سال کے بعد اس کی اندھیری زندگی میں سورج جاگا۔ اور

بی بی کے جسم اور روح کا کونا کونا اس کی میٹھی مہربان گرمی پہنچانے والی خوشی سے تپ اٹھا۔ اور وہ سوچنے لگی کہ جو کچھ اس نے اور اس کے خاوند نے برداشت کیا تھا اس کے بچے کو وہ سب برداشت نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ اب چمڑے کے جوتے پہنے گا اور زربفت کے تار اوڑھے گا اور بجلی کی روشنی میں رہے گا۔ اور کالی محراب سے بہت دور کسی عمدہ سے فلیٹ میں اپنی ماں کے لئے ایک چاند سی بھولائے گا۔ ایسی بہو جو کہانیوں میں شرماتے ہوئے آتی ہے اور ہولے سے گھونگھٹ اٹھا کر اپنی ساس کے قدموں میں گر جاتی ہے۔ اور فضا میں چوڑیوں کی چھنچھناہٹ پہاڑی گیت کی تان کی طرح گونج اٹھتی ہے۔

لیکن ایسا نہ ہوا۔ اعظم کو دسویں پاس کرنے کے بعد بھی کہیں نوکری نہ ملی اور سورج دور ہوتا گیا۔ خوبصورت فلیٹ اور چاند سی بہو کے خیالی افسانے ایک گہرے اندھے کنویں میں ڈوب گئے۔ اعظم تین سال سے بیکار تھا اور تین سالوں میں بی بی تیس سال اور بوڑھی ہو گئی۔ اور اس کے گال یوں لٹک آئے جیسے لٹکی ہوئی زندگی ابھی گر کر موت کی گود میں سو جائے گی۔

سداشو اور پاربتی محراب کے اس حصے میں سوتے تھے جو اُن کی دوکان کے قریب تھا۔ یعنی گرانٹ روڈ کے بازار کی طرف، اندھے بھکاری کی

سونے کی جگہ سے کچھ آگے۔ سداشو اور اس کی بیوی اپنے ہمسایوں سے نسبتاً خوشحال تھے حالانکہ دوکان کا کرایہ بھی کارپوریشن نے اچھا خاصا رکھ چھوڑا تھا۔ مرادآبادی برتن والے کو تو بہت آمدنی ہو جاتی تھی۔ لیکن پھول والے کا مشکل سے خرچ چلتا تھا۔ کرایہ الگ، پھول مہنگے۔ روز بروز مہنگے ہوتے جا رہے تھے۔ ہاں، کبھی کبھی وہ رستم جی مستری کے باغیچے سے رحیمو سے ساز باز کر کے سستے پھول خرید لیتا تھا۔ اس دن زیادہ پیسے بچ جاتے تھے۔ پھر بھی زندگی میں کچھ رس تھا۔

پاربتی بڑی محنت کرنے والی بیوی تھی۔ اتنی ہنس مکھ کہ ہنستے ہنستے اس کے ناک کی خوبصورت موتیوں والی نتھ بھی مسکرا اٹھتی۔ اور اس کی کاسنی رنگ کی ریشمی چولی پر سہاگ والی باریک زنجیر بھی ہنستے ہنستے دوہری ہو جاتی۔ پاربتی اور سداشو دونوں کولہاپور کے ایک گاؤں سے آئے تھے۔ وہاں ان کے ماں باپ تھے۔ تھوڑی سی زمین تھی۔ ڈھور ڈنگر تھے بہت سا قرضہ تھا۔ یہاں بمبئی میں رہ کر سداشو اور پاربتی اپنی محنت سے جی رہے تھے۔ اور تھوڑا تھوڑا قرضہ بھی اتار رہے تھے۔ ان کا ایک چھوٹا سا بچہ بھی تھا۔ بھیما، جو تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ بھی اپنے ماں باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ دن میں اسکول میں پڑھتا۔ شام کو گرانٹ روڈ پہ جوتے پالش کرتا تھا۔ اتوار کو پورا دن ملتا تھا۔ اس دن اسے

پانچ چھ روپے مل جاتے تھے، جس میں سے دو ڈھائی روپے سنتریوں اور دوسرے امیدواروں کی نذر کرنے کے بعد بھی اس کے پاس ڈیڑھ دو روپے بچ جاتے تھے۔

دن بھر اور رات گئے تک سدا شو دوکان پر بیٹھا پھل بیچتا اور پاربتی محراب کے فرش پر بیٹھ کر سوت کے تاگوں میں پیلے پیلے پھول باندھ کر گول گول دھنتیاں جوڑے کے لئے اور لانبی لانبی ویناں چٹیا کے لئے اور دوج کے چاند کی طرح کی سی ویناں دو چوٹیوں میں باندھنے کے لئے تیار کرتی۔ پھر گجرے اور ہار اور چھوٹے چھوٹے گلدستے جن پر عطر چھڑکا جاتا اور جنھیں شوقین مزاج لوگ تحفہ کے طور پر لے جاتے۔ پھول دن کو کم بکتے ہیں اور رات کو زیادہ۔ کیونکہ قریب میں پون پل کا بازار دن کو سوتا ہے رات کو جاگتا ہے۔ اور ان مکانوں کی نرالی نرالی قہقہوں کی آوازیں پھولوں کی مہک اور موسیقی کی لے مارواڑی کی توند مانگتی ہے۔ اور ہلکے پھلکے چپل ان بھاری توندوں کا بوجھ اوپر اچھالتے ہوئے اندھیرے زینوں کے اوپر چلے جاتے ہیں اور اپنے بوجھ کو کسی تکیے کی گود میں پھینک دیتے ہیں۔ اور پھر ان کی موٹی ناف سے لکشمی دیوی کنول کے پھول کی طرح کھِلتی ہے۔ ایک نہیں سو سو کی ہزاروں لکشمی دیویاں بلیک مارکیٹ کے سونے سے لدی ہوئی چھم چھم کرتی ہوئی نکلتی ہیں۔ اور کالی محراب کا

سونے والا سداشو سوچتا ہے کہ جو پھول سجاتے ہیں لکشمی انہی کے لئے ہے۔ جو دن رات کی محنت سے سمندر کو متھ کر لکشمی نکالتے ہیں۔ کیوں ان کے لئے صرف زہر ہے اور لکشمی دوسروں کے لئے؟

اور جب اس کا اسے کوئی جواب نہیں ملتا ہے تو وہ پلکیں بند کر کے سو جاتا ہے اور اس کے پاؤں میں اس کی بیوی اور اسی کے قریب اس کا پیارا بچہ بھیا اپنے بستے پر سر رکھ کے زمین پر سو جاتا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ اس کے پاس جغرافیہ کی کتاب نہیں ہے۔ صبح اسے بہت جلد اُٹھ کر اسٹیشن پر پہنچ جانا چاہیئے۔ سات آنے بوٹ پالش کرنے کے عوض اگر اسے مل جائیں تو اس کے لئے جغرافیہ کی کتاب آ سکتی ہے۔ اور اسی وقت جب پون پل پر سے گذرنے والا سیٹھ گوری یا ہیوں، گدگدی رانوں اور خوشبودار گجروں کا تصوّر کرتا ہے تو کالی محراب کے نیچے سوتے ہوئے بچے کے دماغ میں کالے اور بھورے جوتوں کے سپنے جاگتے ہیں۔ یہ طبقاتی جدوجہد جو زندگی کے ساتھ جڑی ہوئی سپنوں میں بس جاری رہتی ہے۔

ان لوگوں کے درمیان میں جو جگہ بچتی ہے، وہ سڑک کا درمیانی حصّہ ہے۔ اس درمیانی حصّے میں کھاٹ بچھا کر ہمت راؤ سوتا ہے۔ ہمّت راؤ دوسری جنگ عظیم کا زخمی سپاہی ہے۔ اس کا چہرہ بے طرح

سوکھ چکا ہے، اور اس کی آنکھیں اندر کو، گویا گڈھوں میں اندھیرے پانی کی طرح چمکتی نظر آتی ہیں۔ اس کے بائیں بازو پر۔ بازو کے بجائے لوہے کا ہک لگا ہوا ہے اور دائیں ٹانگ گھٹنے سے کٹی ہوئی ہے۔ وہ بیساکھی کی مدد سے چلتا ہے، ہک کی مدد سے لوگوں کو ڈراتا ہے اور سینے پر آویزاں تمغے سے سنتریوں سے دوستی گانٹھتا ہے۔ ہمّت راؤ کوئی کام نہیں کرتا۔ اسے جو کام کرنا تھا وہ جنگِ عظیم میں کر چکا۔ اسے تیس روپے پنشن ملتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ پنشن یافتہ سپاہی ہونے کے رعب میں اور سنتری کی مدد سے محراب میں سونے والوں سے کرایہ بھی وصول کرتا ہے۔ کوئی قانون اسے اس کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن سبھی اس کی دھونس میں آکر اسے کرایہ دے رہے ہیں۔ اور پھر سنتری اس کی حمایت کرتا ہے۔ اور لوگوں کو یہ بھی شک ہے کہ دونوں ملے ہوئے ہیں اور کرایہ بانٹ کھاتے ہیں۔ لیکن اس شک کے باوجود کچھ نہیں کہہ سکتے۔ چپکے سے کرایہ دے دیتے ہیں۔ ورنہ ہمّت راؤ، شاید سنتری سے کہہ کر اور سنتری تھانے والوں سے کہہ کر یہ محراب خالی کرا دے گا۔ اور پھر وہ لوگ کہاں جائیں گے۔ کس محراب کا سہارا تلاش کریں گے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ جہاں کوئی محراب ہوگی، وہاں کوئی ہمّت راؤ نہ ہوگا۔ کوئی سنتری نہ نہ ہوگا۔ کوئی ایسا آدمی نہ ہوگا جو اپنی طاقت، اپنی دھونس۔ اپنی چالاکی

سے ان سے رات کے سونے کے لئے کرایہ وصول کرے گا۔ اسی لئے سدا شو
اور اس کی بیوی چار روپے کرایہ ادا کرتے ہیں۔ اور باقی لوگ دو روپے
اور اندھا بھکاری صرف ایک روپیہ دیتا ہے۔ لیکن وہ تو بھکاری ہے۔
وہ اگر آٹھ آنے بھی دیتا تو کچھ بُرا نہیں تھا۔
کبھی ہمت راؤ اتنا بُرا آدمی نہیں تھا۔ آدمی تو وہ اب بھی بُرا نہیں
ہے۔ لیکن کیا کرے تیس روپے میں کوئی کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔ اور اب
وہ کوئی کام بھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے اگر وہ دھونس دے کر اپنی زندگی
کاٹنے کی سبیل نہ کرے تو کیا کرے؟ مدت ہوئی دوسری جنگِ عظیم سے پہلے
وہ طرح دار جوان تھا۔ اپنے گاؤں کی سب سے حسین لڑکی انجنا کا عاشق
جو اس سے محبت کرتی تھی۔ ہمت راؤ مرہٹہ راجپوت تھا۔ اس لئے جب دوسری
جنگِ عظیم کا آغاز ہوا تو وہ انجنا سے شادی کئے بغیر ہی فوج میں بھرتی ہو گیا
وہ اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ کیونکہ حسین لڑکیاں کب کسی کا انتظار
کرتی ہیں۔ اگر کرنا بھی چاہیں تو ان کے ماں باپ انھیں انتظار کرنے کی
مہلت نہیں دیتے۔ چنانچہ جب ہمت راؤ اپنی آنکھوں پہ پٹی باندھے
ہسپتال میں زخمی پڑا تھا تو اس کی انجنا کی سگائی ہو رہی تھی۔ اور جب
اس کے گھٹنے کا آپریشن ہوا اور اس کی آدھی ٹانگ کاٹ ڈالی گئی اور
اس کے بازو میں ٹھک سا لگا دیا گیا تو اس کی محبوبہ کی شادی کے سامان

ہو رہے تھے۔ اور جب وہ تمغہ لگائے فخر سے چھاتی تانے اپنے گاؤں میں داخل ہوا جو کولہا پور میں تھا تو اسے کسی نے بتایا کہ انجنا شادی کر کے گاؤں سے باہر جا چکی ہے اور اس کا شوہر اسے بمبئی لے گیا ہے۔ اس دن سے آج تک ہمت راؤ راجپوتی انتقام کی آگ دل میں لئے بمبئی کے کونے کونے میں انجنا اور اس کے شوہر کو ڈھونڈتا رہا۔ اسی تلاش میں اس نے پولیس والوں سے یارانہ گانٹھا۔ چالوں کے دادا لوگوں اور غنڈوں، جیب کتروں اور چوروں سے جان پہچان کی، جو بمبئی کے ہر کمرے کا اسباب گن کر بتا سکتے ہیں۔ لیکن اسے انجنا اور اس کے شوہر کا کچھ پتہ نہ چلا۔ اور وہ تھک ہار کر اس کالی محراب کے نیچے پناہ گزیں ہو گیا۔ وہ دن بھر وہیں بیٹھا رہتا۔ مہینے میں ایک بار پنشن لینے جاتا۔ ورنہ دن بھر بیٹھا گپ لڑاتا رہتا۔ وہ ہر لڑائی کا حال جانتا ہے۔ وہ ہر مورچے پر موجود ہے۔ اور ہر مورچے پر اسی نے سب سے زیادہ بہادری دکھائی ہے۔ ہر بار رات کو وہ نت نئی کہانی سناتا ہے وہ کہانی جو پہلی کہانی سے مختلف ہوتے ہوئے بھی ایک ایسی کہانی ہوتی ہے جس کا ہیرو ہمیشہ ہمت راؤ ہوتا ہے۔ اور اس کے گرد ایک روشن ہالہ سا آخر میں آ کر شعلے کی طرح لپکنے لگتا ہے اور اس ہالے کو دیکھتے ہوئے لوگ سو جاتے ہیں۔ سداشو اور پاربتی کی خوشی اکثر ہمت راؤ سے برداشت نہیں ہوتی۔

اس لئے وہ ان سے اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھ جاتا ہے اور لڑنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ ایک دفعہ اس نے سدا شو کو تو بالکل پیٹ دیا تھا، اگر سنتری بیچ میں نہ پڑتا۔ ایک دفعہ اس نے سدا شو کے لڑکے کو زور سے چانٹا بھی مار دیا تھا۔ اور پاربتی اس وقت گرج کر اس کے سامنے لال آنکھیں نکالے بڑے خوفناک انداز میں آگئی تھی اور ہمت راؤ وہاں سے کھسیا کے پرے ہٹ گیا تھا۔

لیکن ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے بھی رہیں چوڑی محراب میں ایک بستر کی جگہ خالی تھی۔ اور دنیا میں جہاں کہیں خلا ہوتا بھر جاتا ہے۔ اس جگہ پر دو شخص آکر سوتے تھے۔ دن کو ایک لڑکی آکر سوتی تھی۔ اس کا نام رما تھا۔ اور وہ بنگال سے آئی تھی۔ وہ دن کو آکر سوتی تھی۔ اور رات کو کہیں چلی جاتی تھی۔ رات کو رام سنگھ آکر سوتا تھا۔ رام سنگھ پنجاب کا رہنے والا تھا۔ اور جب وہ پنجاب کے دنگے سے بھاگ کر بمبئی آیا تو اس کے پاس اپنے جسم کے کپڑوں سے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ ہاں ایک فلوٹ بھی تھا۔ فلوٹ وہ بہت اچھا نہیں بجاتا تھا۔ پھر بھی کبھی نہ کبھی فلم کمپنی میں فلوٹ بجانے کا کام مل جاتا یا کسی تھیئٹر یا کسی پارٹی تماشے میں کوئی نہ کوئی فلوٹ بجانے کا کام اسے دلا دیتا۔ یہ زیادہ تر وہی آدمی ہوتے جنھوں نے اسے پہلے فلوٹ بجاتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ اور جو اسے ایک بار کام نہ دیتا

دوبارہ مشکل سے راضی ہوتا۔ بات یہ نہیں تھی کہ رام سنگھ کو فلوٹ بجانا نہیں آتا تھا۔ فلوٹ تو وہ بجا لیتا تھا، لیکن فلوٹ بجاتے وقت وہ اپنی مرضی سے کام لیتا تھا۔ اور پھر اکثر ایسا ہوتا کہ سارا آرکسٹرا کہیں اور جا رہا ہے اور فلوٹ کہیں اور جا رہا ہے۔ اس لئے وہ آج تک اسی کالی محراب کے نیچے رہنے پر مجبور تھا۔ گو کئی فلوٹ بجانے والوں کے پاس گھر اور گاڑی تک ہو گئی تھی، مگر رام سنگھ کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنے فلوٹ کی مدد سے دونوں چیزیں حاصل کرے گا۔ اور پھر اس بانو کو بیاہ کر لائے گا جس سے اس نے منٹگمری کے چک نمبر ۲۴۴ میں محبت کا پیمان باندھا تھا۔

مگر رام سنگھ کے آنے پر محراب کے لوگ اتنی آسانی سے نہیں مانے کہ وہ یہاں رہے۔ باقی جو لوگ تھے وہ ہمت راؤ کے آنے سے پہلے یہاں رہ رہے تھے لیکن ہمت راؤ کے آنے کے بعد اور اسے کرایہ دینے کے بعد محراب کے باشندے ضرور محسوس کرتے تھے کہ اس صلہ میں ہمت راؤ کسی اور کو محراب کے اندر نہیں گھسنے دے گا۔ چنانچہ جب ایک رات کو رام سنگھ تھکا ہارا ادھر سے گذر رہا تھا تو محراب کو دیکھ کر اس کا جی للچایا۔ اور وہیں خالی جگہ پر جہاں دن کو رماسوتی بھی سونے کی تیاری کرنے لگا کہ ہمت راؤ للکارا۔

"کون ہے تو؟"

"تو کون ہے؟"

ہمت رائے:۔ "میں سپاہی ہوں"
رام سنگھ:۔ "میں پنجابی ہوں"
ہمت راؤ:۔ "تو یہاں نہیں سو سکتا"۔
رام سنگھ:۔ "کیسے نہیں سو سکتا۔ میں تو ضرور سوؤں گا"۔
ہمت راؤ:۔ "اگر تو سوئے گا تو میں اسی ٹُہک سے تیرا اگلا پھاڑ دوں گا"۔
رام سنگھ:۔ "میں تیری ٹانگیں چیر دوں گا اور تیری دوسری ٹانگ کا بھی آپریشن کر دوں گا"۔

دونوں لڑنے کے لئے ایک دوسرے کے قریب گئے۔ اتنے میں سنتری جو راؤنڈ پر تھا آکر کہنے لگا، کیوں لڑتے ہو ہمت راؤ؟ اسے بھی رہنے دو نا! بیچارہ رنیوجی ہے۔ کیوں سردار جی، کرایہ دو گے نا؟ اور پھر وہ ہمت راؤ سے کہنے لگا۔ "کرایہ لے لینا سردار جی سے۔ کیوں سردار جی؟"

رام سنگھ:۔ "سالی سڑک پر سونے کا کرایہ بھی کہیں سنا تھا؟ ہمارے پنجاب میں کتے بھی یہاں نہ سوئیں۔ مگر کیا کریں وقت ہی ایسا ہے۔ اچھا کرایہ دیں گے۔ مگر اس وقت نہیں جب ہو گا دیں گے۔ کتنا کرایہ ہے یہاں سونے کا؟"

ہمت راؤ:۔ "دو روپے مہینہ"۔ رام سنگھ نے ادھر ادھر اوپر نیچے محراب کے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔ "جگہ بری نہیں، آگے برسات آ رہی ہے۔ اچھا دو روپے دیں گے"۔ اتنا کہہ کر رام سنگھ نے ٹانگیں پھیلا دیں اور فلوٹ بکس کو اپنا تکیہ بنایا اور سو گیا!

کرشن چندر

ہائیڈروجن بم کے بعد

جب پردہ اُٹھتا ہے تو اسٹیج کے مرکز میں زمین اپنے محور پر گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔ پس منظر میں پھیلا ہوا آسمان ہے جس کی پہنائیوں میں ستارے ٹمٹمارہے ہیں۔ اور آتشیں گیسوؤں کے پتوار چکر کھارہے ہیں۔ دُور دُور تک، ایک سرے سے دوسرے سرے تک دودھیا ستاروں کی کہکشاں کھلتی چلی جارہی ہے۔ چاروں طرف سناٹا ہے اور ایک ہلکی ہلکی مدھم سی روشنی چاروں طرف چھائی ہوئی ہے۔

اسٹیج کے دائیں طرف ایک آدمی نیم اندھیرے، نیم اُجالے میں کھڑا ہے۔ اس کا چہرہ زمین کی طرف اور پشت تماشائیوں کی طرف ہے۔ وہ ایک بُت کی طرح جامد و ساکت کھڑا ہے اور اس پورے منظر میں اسی طرح کھڑا رہتا ہے۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ایک آواز سرِ اُفق سے آتی ہوئی سناٹے میں گونجنے لگتی ہے۔

کورس۔ بہت عرصہ نہیں گذرا۔

یہ آدمی

اس زمین پر رہتا تھا۔
وہ پھولوں کے پاس گیا۔
پھولوں نے اسے خوشبو دی۔
وہ شہد کی مکھی کے پاس گیا۔
شہد کی مکھی نے اسے شہد دیا۔
وہ عورت کے پاس گیا۔
عورت نے اسے چاند اور سورج دیئے۔
اور وہ بہت بڑا ہو گیا۔
وہ اس زمین کا دیوتا تھا۔
گھاس اس کے قدموں میں جھکتی تھی۔
اور مخمل کا غالیچہ بن جاتی تھی۔
درختوں نے باہیں پھیلا کر اسے سیب دئے۔
جانور اپنے بیٹوں کا دودھ لائے۔
ننھے ننھے کیڑوں نے شہتوت کے پتے کھائے۔
اور اس کے لئے ریشم کے جال اُگلے
ہوا نے اسے سانس دی۔ روشنی نے قوت اور پانی نے حرکت

اور وہ بہت بڑا ہو گیا۔
اس نے اپنا سر اونچا کیا اور آسمان پر اپنی نگاہ کی کمند پھینکی۔
اور ستاروں پر قدم رکھتا ہوا کہکشاں کو پھلانگ گیا۔
پھر اس نے بادلوں سے قوسِ قزح چھین لی۔
اور اسے ایک ہل کی طرح زمین میں گاڑ دیا۔
اور دھرتی کے سینے سے گندم کا دانہ پیدا ہو گیا۔
ایک روز وہ ایٹم کے سینے میں گھس گیا۔
اور وہاں سے ایک جلتا ہوا بم نکال لایا۔
(حالانکہ وہ موتی بھی لا سکتا تھا)
یکایک ہواؤں کے رنگ اڑ گئے۔
اور فضاؤں کے رخسار فق ہو گئے۔
زمین شاخِ لرزاں۔
آسمان عکسِ پریشاں۔
گائے نے اپنے بچھڑے کی طرف دیکھا۔
پھول نے اپنی خوشبو کے لئے فریاد کی۔
نغمہ اپنی بلبل کے لئے رویا۔
اور مستقبل اپنی کلی کے لئے۔

بچے نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔
لیکن آدمی نے اپنے بچے کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور آگے بڑھ کر بم کو فضاؤں میں اچھال دیا۔

اور یکایک عورت کی کوکھ میں چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔
اسٹیج پر ایک زور کا دھماکہ ہوتا ہے۔ روشنی ایک کوندے کی طرح لپکتی ہے۔ پھر چاروں طرف دھند، غبار، آتشیں ہواؤں کے فراٹے۔ بچوں اور عورتوں کی دلخراش چیخیں۔ اندھیرے میں لوگ گرتے پڑتے سایوں کی طرح بھاگتے نظر آتے ہیں۔ پھر مکمل اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اب کہیں کوئی آواز نہیں ہے۔ کوئی حرکت نہیں ہے۔ روشنی نہیں ہے۔ صرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

(پردہ)

منظرِ اوّل

جب پردہ اُٹھتا ہے تو اسٹیج کے بائیں طرف آخر میں ونگ کے قریب ایک چھوٹا سا ٹکٹ گھر نظر آتا ہے جس کے اوپر جلی حروف میں لکھا ہے —

آدمیوں کا چڑیا گھر
ٹکٹ چار آنے

اس چڑیا گھر کی کھڑکی پر ایک لنگور بیٹھا ہے اور ٹکٹ کاٹ کاٹ کے دے رہا ہے۔ ٹکٹ گھر کے سامنے جانوروں کا لمبا کیو لگا ہے۔ اس کیو میں بندر، بکری، خرگوش، نیل گائے، شیر، مینڈھے، گدھے، گینڈے۔ طرح طرح کے جانور نظر آتے ہیں۔ جو صاف ستھرے لباس پہنے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ٹکٹ خرید رہے ہیں۔ ٹکٹ گھر کے بالکل قریب چڑیا گھر کا دروازہ ہے جس کی آہنی محراب کے اوپر یہی الفاظ کندہ ہیں۔

"آدمیوں کا چڑیا گھر"

اس آہنی دروازے کے باہر ایک بن مانس گھنٹی بجا بجا کر چلاّ رہا ہے۔

بن مانس:۔ آئیے آئیے آدمیوں کے چڑیا گھر دیکھیے!

کُرّۂ ارض پر آدمیوں کا پہلا اور آخری چڑیا گھر۔

یوم آزادی کی خوشی میں ٹکٹوں کی قیمت میں شاندار رعایت۔

چار آنے کا ٹکٹ دو آنے میں۔

لیڈیز اور بچوں کے لئے خاص رعایت۔

ایک ٹکٹ ایک آنے میں۔

یوم آزادی کی خوشی میں،

اسٹیج کے مرکز میں ایک گدھا اپنے چار بچّوں کو لئے چل رہا ہے۔ کیو میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ ایک بچہ اس سے پوچھتا ہے۔

گدھے کا بچہ نمبر ۱:۔ "باپو یہ یومِ آزادی کیا ہے؟"

گدھا:۔ "بیٹا آج سے دس سال پہلے جانوروں نے انسانوں کی غلامی سے نجات پائی تھی۔ اس دن کی خوشی میں ہم لوگ یومِ آزادی مناتے ہیں۔"

گدھے کا بچہ نمبر ۲:۔ "ہم نے کیسے یہ آزادی حاصل کی تھی؟"

گدھا:۔ "بیٹا آج سے دس سال پہلے اس دنیا پر انسانوں کا راج تھا۔ اس وقت یہ دنیا آج کی طرح ویران اور اجاڑ نہیں تھی۔ اس وقت اس زمین کا بیشتر حصہ سرسبز اور شاداب تھا۔ اسی وقت انسانوں نے بڑی ترقی کی تھی۔ وہ لوگ اس دنیا کے چپے چپے پر پھیل گئے تھے۔ اور ہم جانوروں کے مقابلے میں بہت اچھی اور خوبصورت زندگی بسر کر رہے تھے۔"

گدھے کا بچہ نمبر ۱:۔ "پھر کیا ہوا؟"

گدھا:۔ "پھر انسانوں میں بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کے لئے بڑے بڑے خوفناک ہتھیار استعمال کئے گئے۔ آخر میں بہت بڑے ہائیڈروجن بم چھوڑے گئے۔ ان بموں نے ساری دنیا سے انسانوں کی آبادی کو نیست نابود کر دیا۔ صرف انسانوں کی آبادی ہی نہیں۔ جہاں جہاں جنگل

تھے، وہ جھلس کے رہ گئے۔ اور ان کے ساتھ ساتھ جہاں جہاں زہریلی گیس اور شعاعیں پھیلیں، وہاں کے تمام جانور بھی مر گئے۔ ہاتھی۔ گھوڑے۔ شیر بکری۔ سب جانور مر گئے۔ گھاس اور درخت اور درختوں کے پتے تک مر گئے۔"

گدھے کا بچہ نمبر ۲:۔ "پھر ہم کیسے بچ گئے؟"

گدھا:۔ "اتفاق سے ہمالیہ کے پہاڑوں میں گھری ہوئی چند چھوٹی چھوٹی وادیاں ان بموں کے زہریلے اثر سے بچ گئیں۔ اسے بھی اتفاق کہیے کہ یہاں کوئی انسان نہ تھا۔ صرف تھوڑے سے جانور تھے جو زندہ رہے، جن کی اولاد ہم ہیں اور جو اس وقت اس عالم خاک وباد پر انسان کی جگہ حکومت کر رہے ہیں۔"

گدھے کا بچہ نمبر ۳:۔ جب سب آدمی مر گئے تو یہ انسان کا چڑیا گھر کہاں سے آیا؟"

گدھا:۔ پانچ سال تک ان بموں کا اثر کرۂ ہوائی میں رہا اور زمین پر رہا۔ اس کے بعد جوں جوں فضا صاف ہوتی گئی اور جانوروں نے یعنی ہم لوگوں نے جو اس وقت اشرف المخلوقات سمجھے جاتے ہیں، آگے بڑھ کے زندگی کے جھنڈے کو تھاما۔ اور اسے پھر کرۂ ارض پر پھیلایا۔ ہماری ان کوششوں کے سلسلے میں

ہمارے جانبازانہ اسکاؤٹ دنیا کے مختلف کونوں میں گئے۔ کہیں کہیں تاریک غاروں میں چھپے ہوئے انھیں یہ چند انسان ملے۔ اپنی نسل کے آخری افراد، اپنی تہذیب و تمدن کے آخری نمائندے۔ تب جانوروں کی کونسل ہوئی۔ اور اس میں یہ قرار پایا کہ ان تمام انسانوں کو لاکے ایک چڑیا گھر میں بند کیا جائے۔ جہاں اپنے جانور بھائیوں اور بہنوں کی تعلیم و تربیت کے لئے انسان کی نمائش کی جائے۔ تاکہ ہماری آئندہ نسلیں انھیں دیکھیں۔ اور ان کی وحشیانہ عادتوں سے سبق سیکھیں۔"

کیوئیں چلتے چلتے گدھا اس وقت بالکل ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے قریب آجاتا ہے۔ وہ ریزگاری بڑھا کے لنگور سے کہتا ہے۔

گدھا:۔ "ایک ٹکٹ میرے لئے۔ چار بچوں کے لئے رعایتی ٹکٹ۔"

لنگور ــــ "او' کے ــــ O.K"

گدھا چار ٹکٹ لے کے اپنے بچوں کے ساتھ گیٹ کے اندر داخل ہوتا ہے۔ گیٹ کے ساتھ ہی لوہے کے جنگلے کے اندر ایک دبلا پتلا آدمی نظر آرہا ہے۔ وہ ایک خاکی رنگ کی نیکر اور پھٹی ہوئی بنیان پہنے ہوئے ہے۔ اور اپنی لمبی ناک پہ بار بار اپنا چشمہ درست کرتا جاتا ہے۔

کبھی کبھی وہ اپنی گنجی چندیا کھجانے لگتا ہے۔ اور کبھی کبھی جانوروں کی طرف دیکھ کے مسکرانے لگتا ہے۔ لوہے کے جنگلے کے اندر ایک چھوٹا سا تالاب ہے جس میں ایک آدمی بخوبی تیر سکتا ہے۔ لانبا دبلا آدمی اپنے سوکھے ہاتھ جانوروں کی طرف بڑھا کے اپنی ناک میں بولتا ہے۔

بینکر:۔ "جلدی کرو۔ جلدی کرو۔ اشرفی نکالو۔ ہمارے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔ ہمیں بورڈ کی میٹنگ میں جانا ہے۔"

گدھے کا بچہ نمبر ۳:۔ "یہ بورڈ کی میٹنگ کیا ہوتی ہے؟"

گدھا:۔ "بیٹا، یہ آدمی اپنے ملک کا سب سے بڑا بینکر تھا۔ اپنے ملک کی تجارت کا بہت بڑا حصہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ ہر روز لاکھوں اشرفیوں سے یہ کھیلتا تھا۔ اس لئے اسے اشرفیاں بہت پسند تھیں۔ ان اشرفیوں کی تعداد کو بڑھانے کے لئے اس نے دوسرے ملکوں کی تجارت کو بھی اپنے قبضے میں رکھنا چاہا۔ اور جب وہاں کے لوگوں نے مزاحمت کی تو اس نے ہائیڈروجن بم تیار کرنے کے لئے ایک بورڈ بنایا۔ یہ خود اس کا صدر بنا اور اپنی نگرانی میں ہائیڈروجن بم تیار کرانے لگا۔ جب اس نے بہت سے ہائیڈروجن بم تیار کر لئے تو اس نے اپنی جان بچانے کے لئے زمین کے اندر ایک خفیہ پناہ گاہ تیار کرائی۔ اور

جنگ شروع کرا کے خود اس کے اندر چھپ کے بیٹھ گیا۔ انسانی آبادی کو ختم کرنے میں اس ظالم کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ جب ہمارے اسکاوٹوں نے اسے پکڑا تو یہ اشرفیوں کے بہت بڑے ڈھیر پر پستول لئے بیٹھا تھا۔ ہمارے دو تین اسکاوٹ اسے پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے مارے گئے۔ آخر ہمارے گینڈے نے اسے پکڑ لیا۔ گینڈے پر تم جانتے ہو ان چھوٹے پستولوں کی گولیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا!"

گدھے کا بچہ نمبر ۴:۔ (اپنے لمبے لمبے کانوں سے تالی بجا کر) "ہاہا۔ اچھا ہوا گینڈے نے اسے پکڑ لیا۔"

بینکر:۔ (چشمہ ٹھیک کر کے چٹکی بجاتے ہوئے) "جلدی کرو۔ اشرفی نکالو۔ ہمارے پاس ٹائم نہیں ہے۔"

گدھا جلدی سے اپنے بٹوے سے سونے کا ایک سکہ نکال کے پانی کے تالاب میں پھینکتا ہے۔

بینکر چشمہ تالاب کے کنارے رکھ کر جلدی سے تالاب میں ڈبکی لگاتا ہے۔ اور تالاب کے فرش پر چمکتی ہوئی اشرفی کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر باہر لے آتا ہے۔

بینکر:۔ (اشرفی کو چومتے ہوئے) "اشرفی — ہاہا۔ اشرفی! ہاہاہا۔

ایک سالم اشرفی۔ دنیا کی عظیم ترین خوبصورت شے۔ ایک اشرفی ہاہاہا۔"

(بینکر خوشی سے ناچنے لگتا ہے)

گدھے کا بچہ نمبرا:۔ "یہ اتنا خوش کیوں ہو رہا ہے؟"

گدھا:۔ "بیٹا، یہ بینکر سونے کا پجاری ہے۔ اس کا مقولہ تھا کہ سونا زندگی کے لیے نہیں، زندگی سونے کے لئے ہے۔ یہ زندگی بھر سونا اکٹھا کرنے میں لگا رہا۔ اور آخر میں اس نے اپنی نسل کو بھی اپنے لالچ پہ قربان کر دیا۔"

گدھے کا بچہ نمبر ۲:۔ "مگر سونے کو لے کر تم کیا کرو گے؟ تم اسے کھا نہیں سکتے۔ گھاس کی طرح۔ پی نہیں سکتے پانی کی طرح۔ اس میں سے کچھ اگتا نہیں ہے۔ بیج کو زمین میں ڈال دو فصل پیدا ہو جائے گی۔ سونے کے ٹکڑے کو رکھ دو۔ وہی ایک ٹکڑے کا ٹکڑا رہتا ہے۔ ایسی چیز کو اکٹھا کرنے سے کیا فائدہ؟"

اتنے میں ایک مینڈھا اشرفی پھینکتا ہے۔ تالاب میں۔ بینکر پھر اپنا چشمہ رکھ کے تالاب میں اشرفی نکالنے کے لئے کود پڑتا ہے۔ گدھے کا بچہ چشمہ اٹھانے کے لئے آگے بڑھتا ہے۔۔۔ گدھا روک لیتا ہے۔

گدھا:۔ "نہیں بیٹا! یہ بے چارہ اس کے بغیر نہیں دیکھ سکتا۔"

گدھے کا بچہ نمبر ۳:۔ "کیوں نہیں دیکھ سکتا؟ جب سب جانور اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں تو یہ چشمہ کے بغیر کیوں نہیں دیکھ سکتا؟"

گدھا:۔ "اس لئے کہ انسان جانوروں سے زیادہ مہذّب ہے۔"

اتنے میں گدھے کا دوسرا بچّہ تالاب میں گلاب کا پھول پھینک دیتا ہے۔ بینکر جھٹ جھپٹا مار کے اسے اپنی ہتھیلی میں لے لیتا ہے۔ لیکن جب عینک لگا کر اپنی ہتھیلی کی طرف دیکھتا ہے تو اشرفی کی بجائے پھول دیکھ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اور غصّے سے چلانے لگتا ہے۔

بینکر:۔ "او بلڈی سوائن۔ گدھے کے بیوقوف بچّے! ہم کو اشرفی کے بجائے گلاب کا پھول دیتا ہے۔ ہمارا ٹائم ضائع کرتا ہے۔ ہم تم کو جان سے مار دے گا۔ ہم تمھارے سر کے اوپر ایٹم بم مارے گا۔ تم کو اس زمین سے نیست و نابود کر دے گا۔ ہم تم کو....."

بینکر اپنا فقرہ پورا نہیں کر سکتا، کیونکہ گدھے نے ایک اور اشرفی نکال کے تالاب میں پھینک دیتا ہے۔ بینکر نے اسے نکالنے کے لئے تالاب میں ڈبکی لگا تا ہے۔ وہ تیرتا ہوا پانی کے اندر اشرفی ڈھونڈنے لگتا ہے۔

گدھا:۔ "اسے گلاب کے پھول سے سخت نفرت ہے۔"

گدھے کا بچہ نمبر ۲:- "کیوں؟"

گدھا:- "اسے ہر اس چیز سے نفرت ہے جو سونا نہیں ہے۔ اس لئے ہم لوگوں نے اس چڑیا گھر میں اس کے لئے یہ پانی کا تالاب بنا دیا ہے۔ تاکہ یہ دن بھر ڈبکیاں لگاتا رہے اور اشرفیاں ڈھونڈ کر نکالتا رہے۔ شام تک اس کے پچاس پچاس ساٹھ کے قریب اشرفیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ وہ رات کے وقت بیٹھ کر بار بار انھیں گنتا ہے۔ رات بھر یہ سوتا نہیں۔ بس انھیں اشرفیوں کو گنا کرتا ہے۔ صبح اٹھ کے محافظ اس سے یہ اشرفیاں چھین لیتا ہے۔"

گدھے کا بچہ نمبر ا:- "تو یہ روتا نہیں؟"

گدھا:- "نہیں اس کا محافظ بندر ہے۔ وہ بہت چالاک ہے۔ وہ اس سے یہ کہہ کے اشرفیاں لے لیتا ہے کہ انھیں تمھارے بینک میں جمع کرنے جا رہا ہوں۔ ہر روز اسے کاغذ کی ایک رسید دے دیتا ہے۔ وہ کونے میں جو تم کاغذوں کا پلندہ دیکھتے ہو وہ ان اشرفیوں کی رسیدیں ہیں جنھیں یہ بینکر بہت سنبھال کر رکھتا ہے۔"

گدھے کا بچہ نمبر ا:- "ان کاغذ کے پرزوں کو وہ لے کر کیا کرے گا؟"

گدھا :۔ "یہی کاغذ کے پُرزے اس کا سرمایۂ حیات ہیں۔ جب یہ مرجائیگا تو تاریخ ان کاغذ کے پرزوں کو دیکھ دیکھ کر ہنسے گی اور روئے گی۔ اور کہے گی، انسانوں کی پوری آبادی ان کاغذ کے پرزوں کے لئے لڑتے لڑتے مرگئی۔ آؤ اب آگے چلیں۔

(گدھا اور اس کے بچے آگے چلے جاتے ہیں)

شاعر

بینکر کے جنگلے سے ملحق سیب کے ایک اونچے پیڑ کے نیچے ایک آدمی جس کا چہرہ گول ہے اور جس کی آنکھیں بڑی بڑی ہیں، اپنے ہاتھ میں ایک کاغذ کا پرزہ لئے کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک پنسل ہے جس سے بار بار وہ کاغذ پر کچھ لکھتا ہے۔ پنسل کو کان پر رکھتا ہے۔ پھر پنسل لے کر کچھ لکھتا ہے۔ پھر کان پر پنسل کو رکھ لیتا ہے۔ اس آدمی کے ارد گرد ایک خوبصورت باغیچہ ہے، جس میں رنگا رنگ کے پھول ہیں۔ مگر یہ آدمی اپنے گردوپیش کی دنیا سے بے نیاز ہوکر درخت کے نیچے ٹہل رہا ہے۔ اور لکھتا جاتا ہے۔ یکایک یہ آدمی لکھتے لکھتے رک جاتا ہے۔ اور پھر بآوازِ بلند پڑھنے لگتا ہے۔

شاعر :۔

میکدے کی زمیں نہیں بدلی — سطوتِ ساتگیں نہیں بدلی

وہ تمنّا جو ایک مُدّت سے — دل میں تھی جاگزیں نہیں بدلی

حُسن والو تمہیں مبارک ہو — عِشق کی سرزمیں نہیں بدلی

تیری زلفوں سے اس کو نسبت ہے — ورنہ اتنی حسیں نہیں بدلی

تو ہی اے دل بدل گیا ورنہ — کوئی صورت حسیں نہیں بدلی

گدھا :۔ "ساری دنیا بدل گئی لیکن اس کے لئے کچھ نہیں بدلا۔"

گدھے کا بچہ نمبر ۱ :۔ "یہ کون ہے؟"

گدھا :۔ "یہ شاعر ہے۔"

گدھے کا بچہ نمبر ۲ :۔ "یہ کیا کر رہا ہے؟"

گدھا :۔ "اپنی محبوبہ کی تعریف میں شعر پڑھ رہا ہے۔"

گدھے کا بچہ نمبر ۳ :۔ "اس کی محبوبہ کہاں ہے؟"

گدھا :۔ "وہ ہائیڈروجن بم کے حملے میں مر گئی۔"

گدھے کا بچہ نمبر ۴ :۔ "اس نے اسے بچانے کی کوشش نہیں کی؟"

گدھا :۔ "جب ہائیڈروجن بم تیار ہو گیا تو کچھ دانشور لوگ (کیونکہ انسانوں میں بھی کچھ عقل مند آدمی تھے) اس کے پاس ایک عرضداشت لے کے آئے تھے جس میں تمام لوگوں سے یہ کہا گیا تھا کہ وہ

سیاست دانوں کو مجبور کریں کہ وہ اس خطرناک جنگ کو شروع نہ کریں تاکہ انسانوں کی آبادی اس ہیبت ناک ہلاکت سے بچ جائے۔ وہ لوگ اس عرضداشت پہ اس شاعر کے دستخط چاہتے تھے۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔"

گدھے کا بچہ نمبر ا:۔"کیوں؟"

گدھا:۔" اس نے کہا "میں صرف حسن و عشق کا شاعر ہوں۔ مجھے صرف محبت سے سروکار ہے۔ میں کسی قسم کی سیاست سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔"

شاعر پھر گانے لگتا ہے۔

شاعر:۔

اسی کا نام ہو شاید محبت — خطا ان کی ہے ہم شرما رہے ہیں
کہیں تارِ نظر الجھا ہوا ہے — نقاب اُٹھتی نہیں شرما رہے ہیں
بھری برسات کی اف رے جوانی — گھٹاؤں کو پسینے آ رہے ہیں
اجل کو روکنا آواز دینا — ذرا ہم میکدے تک جا رہے ہیں

گدھے کا بچہ نمبر ا:۔" اس کا میکدہ کہاں ہے؟"

گدھا:۔" اس کا میکدہ بھی گیا۔ ساقی بھی گیا۔ اس نے دونوں کو بچانے کے لئے رتی بھر کوشش نہیں کی۔"

گدھے کا بچہ نمبر ا :۔ " پھر یہ کیسی محبت تھی ؟ "

گدھا :۔ "معلوم نہیں ۔ مگر بیٹا ! یہ آدمی بہت ذہین تھا ۔ اس کے الفاظ میں جادو اور اس کے تخیّل میں عقاب کی سی اُڑان تھی ۔ اگر یہ چاہتا تو اپنے نغمے سے دنیا کو آنے والے خطرے سے خبردار کر سکتا تھا ۔ اگر یہ چاہتا تو اپنے شعر کو ڈھال بنا کے اپنے ساقی اور جام کے لئے سینہ سپر ہو کر لڑ سکتا تھا ۔ لیکن اس نے گرد و پیش کی دنیا سے آنکھیں بند کر لیں ۔ اور اپنے خوبصورت توہمات میں کھو گیا ۔ اس کا میکدہ اس کے سامنے منہدم ہو گیا ۔ اس کی محبوبہ اس کے سامنے جل گئی ۔ لیکن یہ اپنی شاعری کی اندھی عینک لگائے نہ اپنی مرتی ہوئی محبوبہ کو دیکھ سکا نہ انسانی نسل کی آخری فریاد سن سکا ، وہ فریاد جو اس کے معجز بیانیوں پر صورِ اسرافیل کی طرح گونج سکتی تھی ۔

شاعر پھر گانے لگتا ہے ۔

شاعر :۔ حسن کے ساز پر اک راگ سنا کر جانا
عشق کو اک نئی الجھن میں پھنسا کر جانا
میری سوئی ہوئی قسمت کو جگا کر جانا
مد بھری آنکھوں سے مدہوش بنا کر جانا

گدھا:۔ "جب یہ ان مدھ بھری آنکھوں کی حفاظت نہ کر سکا تو شاعری نے اپنا ناتا انسان سے ہمیشہ کے لئے توڑ لیا۔ اور زمین کے سینے میں ایک خوشبو کی طرح چھپ گئی۔ اب جو کچھ یہ کہہ رہا ہے، یہ شاعری نہیں ہے۔ ایک مردہ تخئیل کی گونج ہے۔ آؤ آگے چلیں۔"

سائنس داں

گدھا اپنے چاروں بچوں کو لئے دوسرے پنجرے کی طرف بڑھتا ہے۔ یہاں ایک بکری اور اس کا خاوند بکرا پہلے سے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔

اس پنجرے میں سفید بالوں والے دو بڈھے کرسیوں پر بیٹھے بہت اطمینان سے باتیں کر رہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے قریب جھکے ہوئے بہت رازدارانہ لہجے میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔ کبھی ایک دوسرے کے کان میں سرگوشی کرتے ہیں۔ کبھی ہنسنے لگتے ہیں۔

پہلا بڈھا:۔ میں نے ایک ایسی شعاع ایجاد کی ہے جسے اگر ایک بمبار ہوائی جہاز میں فٹ کیا جائے۔ یعنی جس طرح ہم انٹی ایر کرافٹ بیٹری کو زمین پر فٹ کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر وہ شعاع کسی بمبار

بمبار ہوائی جہاز سے کسی بڑے شہر پر ڈالی جائے تو وہ شعاع صرف دو منٹ کے اندر ہر جاندار شے کو ختم کر سکتی ہے۔"

دوسرا بڈھا:۔ "اس شعاع کی بیٹری بنانے میں کیا خرچ آئے گا؟"

پہلا بڈھا:۔ "اس کے متعلقہ کاغذات تو اس وقت میرے پاس نہیں ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تین سو کروڑ روپیہ تو ضرور خرچ ہوگا۔"

دوسرا بڈھا:۔ "اور یہ تمہاری شعاع کتنے رقبے میں اپنا ہلاکت آفریں کام کر سکتی ہے؟"

پہلا بڈھا:۔ "۲۵ مربع میل کے گھیرے ہیں۔"

دوسرا بڈھا:۔ "۲۵ مربع میل کے لئے تین سو کروڑ کی لاگت بہت مہنگی پڑے گی۔ بہت ہوا تو زیادہ سے زیادہ تیس لاکھ آدمی مریں گے یعنی فی موت ایک سو روپیہ" (سر ہلا کے) یہ تو بہت مہنگی موت ہے میں نے اس سے بھی سستی موت ایجاد کی ہے۔"

پہلا بڈھا:۔ "کیا؟ آہستہ سے سرگوشی میں بتاؤ۔ کوئی سن نہ لے۔ اگر ایجاد میں دم ہوا تو ہم دونوں مل کر اسے پیٹنٹ کرالیں گے۔

دوسرا بڈھا:۔ میں نے ایک ایسا سفوف ایجاد کیا ہے جسے ہوائی جہازوں کی مدد سے (اس کے لئے بمباروں کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ معمولی ہوائی جہاز کافی ہیں) چاہتے جتنے بڑے رقبۂ زمین

پرچھڑکنے سے اس رقبے میں رہنے والے آدمی ٹڈی دل کی طرح مرجاتے ہیں۔ ٹڈی دل کی طرح! میں نے اندازہ لگایا ہے، چار سو مربع میل کے گھیرے کے لئے دس ٹن سفوف کافی ہوگا"۔

پہلا بڈھا:۔"اس دس ٹن پر کتنی لاگت آئے گی؟"

دوسرا بڈھا:۔"کل اسی کروڑ۔ لیکن میں نے سوچا ہے کہ میں اس ایجاد کی پندرہ فیصدی رائیلٹی لوں گا۔ ہر ٹن پر پندرہ فیصدی رائیلٹی"۔

پہلا بڈھا:۔"ایک ٹن سے کتنے آدمی مریں گے؟"

دوسرا بڈھا:۔"اب یہ تو آبادی پر منحصر ہے۔ صحرائے گوبی یا صحرائے افریقہ میں چار سو مربع میل میں مشکل سے چار آدمی ہی ہوں گے۔ لیکن کرۂ ارض کے جن علاقوں میں آبادی گنجان ہے، وہاں میں سمجھتا ہوں اس سفوف کا استعمال بہت مفید رہے گا۔ ایشیا اور یورپ کے گنجان علاقوں میں آپ کو چار سو مربع میں ایک کروڑ آدمی بھی مل سکتے ہیں"۔

پہلا بڈھا:۔"ایک کروڑ ٹڈیاں!"

دوسرا بڈھا:۔"ہاہاہا۔ خوب کہا۔ کیا ڈھونڈ کے تشبیہ نکالی ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا چار سو مربع میل کے لئے دس ٹن، تو چالیس مربع میل کے لئے ایک ٹن۔ اگر چار سو مربع میل میں ایک کروڑ

آدمی رہتے ہوں تو چالیس مربع میل میں چالیس لاکھ آدمی رہتے ہوں گے، جن کے لئے ایک ٹن سفوف کافی ہوگا۔ ایک ٹن پر آٹھ کروڑ لاگت آتی ہے۔ آٹھ کروڑ پہ پندرہ فیصدی رائیلٹی لگالو۔ اس سے سمجھ جاؤ۔ چالیس لاکھ موتوں پہ مجھے کتنی رائیلٹی نصیب ہوگی۔"

پہلا بڈھا:۔ "تمہارا تو نصیب کھل جائے گا۔"

دوسرا بڈھا:۔ "بدقسمتی سے دشمن کے حملے نے مجھے اندھا کردیا ہے۔ ورنہ میں ایک اور ایجاد پر غور کر رہا تھا۔"

پہلا بڈھا:۔ "کیا — !"

دوسرا بڈھا:۔ "وہ ایجاد اتنی خطرناک ہے کہ صرف کان میں بتائی جا سکتی ہے"

دونوں سائنس دان ایک دوسرے کے قریب جھک کے کانوں میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔

بکرا:۔ "ان ہی دو سائنس دانوں نے وہ بڑے ہائیڈروجن بم ایجاد کئے تھے جن سے انسانی دنیا تباہ ہوگئی۔"

بکری:۔ "لیکن یہ لوگ کس خوشی سے موتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کیا ان کے ہاں بچے نہیں تھے؟"

بکرا:۔ "تھے تو سہی۔ لیکن یہ لوگ سمجھتے تھے۔ کسی نہ کسی طرح ان لوگوں

نے اپنے آپ کو یقین دلا دیا ہو گا کہ بم ہمیشہ دشمن کے گھر پہ گریں گے اور ان کے گھر ہمیشہ محفوظ رہیں گے "

بکری :۔ "عجیب جاہل لوگ ہیں۔"

گدھا :۔ "جاہل نہیں ہیں میڈم۔ یہ لوگ دنیا کے بہترین دانشوروں میں سے تھے اور فطرت کی تسخیر کرنے والوں میں سے تھے۔ اگر یہ چاہتے تو اس دنیا کو رشکِ صد گلزار بنا سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے موت کی شعاع ایجاد کی اور زندگی کی شعاع کی پرواہ نہ کی۔ یہ لوگ موت کا سفوف ڈھونڈتے رہے اور حیات اپنی بقا کے لئے چیختی رہی۔ جب زمین پانی اور بیج کے لئے پکار رہی تھی، یہ اپنی لیبارٹری میں گھسے ہوئے زمین پہ سورج کا درجۂ حرارت لا کے ساری دنیا کو ختم کرنے کی سوچ رہے تھے "۔

پہلا سائنس داں :۔ (چلّا کے) "ہا ہا ہا ہا "

دوسرا :۔ "سچ کہتے ہو سچ!"

پہلا :۔ "لاؤ ہاتھ!"

(دونوں ایک دوسرے سے زور سے ہاتھ ملاتے ہیں)

دوسرا :۔ "کیسی شاندار ترکیب ہے۔ داد دیتا ہوں تمھاری عقل کی۔ کیا سوجھی ہے۔ شاعری ہے شاعری "

پہلا :- "ہاں بتاؤ نا کیسی اچھوتی ایجاد ہوگی یہ، اور کتنی سستی۔ بس ایک چھوٹا سا پلانٹ کافی ہے۔"

دوسرا :- "ایک چھوٹا سا برقی پلانٹ (کھڑے ہو کر جوش میں بولنے لگتا ہے) جو دس گھنٹوں میں ایک پورے بر اعظم کی آکسیجن کو کاربن ڈائی اکسائڈ میں تبدیل کر کے رکھ دے گا۔ اور پانچ دن میں پورے کرہ ارض کی آکسیجن کو ختم کر دے گا۔ اور آکسیجن کے بغیر انسان ایک پل زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہاہاہا۔ کیا ترکیب نکالی ہے!"

پہلا :- "اور کتنی سستی ہے۔ صرف دس ہزار روپے میں ایک چھوٹا سا برقی پلانٹ۔ صرف دس ہزار میں (کھڑا ہو کے چلانے لگتا ہے) ذرا سوچو تو سہی، صرف دس ہزار میں ساری دنیا کی آبادی کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس سے سستی موت اور کیا ایجاد ہو سکتی ہے۔ صرف دس ہزار روپے۔ اور آج کل بھائی زمانہ ایسا ہے۔ لاگت کم سے کم کرو اور منافع زیادہ سے زیادہ دکھاؤ۔ اس حساب سے میری ایجاد . . . . ."

دوسرا :- (یکایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) "مگر دس ہزار میں ہمیں کیا ملے گا؟"

پہلا :- پندرہ فیصدی۔"

دوسرا :۔ "دس ہزار کا پندرہ فیصدی کیا ہوا ؟ یہ بھی سوچا ؟"

پہلا :۔ (دھڑام سے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) "ارے یہ تو بالکل غیر اقتصادی ایجاد ہے۔ اس سے ہمیں کیا ملے گا ؟"

دوسرا :۔ "میرے خیال میں تو وہی ہائیڈروجن بم ٹھیک رہے گا۔"

پہلا :۔ "ہاں وہی ٹھیک رہے گا ۔"

(دونوں میزوں پر سر لگا کر کچھ سوچنے لگتے ہیں)

گدھا اور اس کے چاروں بچے ۔ بکرا ۔ بکری ۔ مینڈھا اور دوسرے جانور آگے بڑھ جاتے ہیں ۔

سیاست دانوں کی کانفرنس

اس پنجرے میں ایک گول میز بچھائی گئی ہے ۔ جس پر سبز رنگ کا کپڑا بچھا ہے ۔ اس میز کے گرد پچیس تیس کرسیاں ہیں ، جن پر مختلف ممالک کے سیاستداں بیٹھے ہیں ۔ ہر ملک کے سیاستداں کے سامنے میز پر ایک تختی رکھی ہے جس پر اس کے ملک کا نام لکھا ہے ۔ ایک چھوٹی میز پر ایک آدمی ان سب سے الگ بیٹھا ہے ۔ اس کے سامنے ٹیلی فون ہے ۔ جب جانور اس پنجرے کے قریب پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ بحث بہت زور شور سے جاری ہے ۔

ملک ج کا نمائندہ :۔ "میرے پاس ایٹم بم ہے ۔ تمہارا بھرکس نکال دونگا۔"

ملک چ کا نمائندہ :۔ "میرے پاس ہائیڈروجن بم ہے ۔ اپنی بکواس بند کرو !"

ملک ت کا نمائندہ :۔ "میرے پاس نائٹروجن بم ہے"۔

ملک ٹ کا نمائندہ :۔ "میرے پاس کوبالٹ بم ہے جو سب بموں کا باپ ہے"۔

چیئرمین :۔ "آرڈر، آرڈر، حضرات! میں اس کانفرنس کے اول مقصد کیطرف آتا ہوں۔ عالمگیر جنگ شروع ہوچکی ہے۔ تمام دنیا آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آچکی ہے۔ اس جنگ سے سارے انسانی تمدن کو خطرہ ہے۔ اگر ہم لوگوں نے جلد سے جلد اس جنگ کو ختم نہ کیا تو ساری دنیا تباہ ہوجائے گی۔ ہمیں لازم ہے کہ ہم فوراً دنیا میں امن قائم کریں۔ یہی اس کانفرنس کا مقصد ہے۔ جنگ ختم کرو۔"

ملک الف کا نمائندہ :۔ "مگر مسٹر چیئرمین سوال یہ ہے کہ یہ جنگ پہلے کس نے شروع کی؟"

ملک ب کا نمائندہ :۔ "تم نے شروع کی"۔

الف :۔ "نہیں۔ تم نے خبیث!"

ب :۔ "نہیں۔ تم نے ڈھپول!"

الف :۔ (مُکا دکھاتے ہوئے) "انسانیت کے دشمن!"

ب :۔ (مُکا مارتے ہوئے) "جمہوریت کے جان لیوا!"

دونوں نمائندے گتھم گتھا ہوجاتے ہیں۔ بہت سے سیاستداں چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

گدھا :۔ "ان لوگوں کو ہمارے اسکاوٹوں نے شہر کا رواک کے تہہ خانے سے پکڑا تھا۔ جہاں یہ لوگ اپنی کانفرنس کر رہے تھے شہر ختم ہوچکا تھا۔ لیکن نیچے تہہ خانے میں ان کی کانفرنس جاری تھی۔"

گدھے کا بچہ نمبرا :۔ "باپو! یہ لوگ اب کیا کر رہے ہیں ؟"

گدھا :۔ "بیٹا! ان کی کانفرنس ابھی تک جاری ہے۔"

اتنے میں کچھ سیاست داں دونوں نمائندوں کو الگ کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ اور کانفرنس پھر شروع ہوجاتی ہے۔

ملک س کا نمائندہ :۔ "حضرات! جنگ ختم کرنے سے پہلے یہ اشد ضروری ہے کہ اس بات کا پتہ چلایا جائے کہ جنگ کس نے شروع کی ؟ اس کے لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ ایک رائل کمیشن فوراً مقرر کیا جائے۔"

ش :۔ "رائل کمیشن! ہا ہا ہا —— یہ معاملے کو کھٹائی میں ڈالنے والی بات ہے۔ میں ایک غیر جانبدار کمیشن کے حق میں ووٹ دیتا ہوں۔ ملک ج چ ح خ پر ایک کمیشن مقرر کیا جائے۔"

اتنے میں ایک آدمی جو ایک الگ چھوٹی سی میز پر کین فون —— EAR-PHONE لگائے بیٹھا ہے گھبرا کے کھڑا ہوجاتا ہے اور چلا کے کہتا ہے۔

آدمی :۔ "شہر بھر اس ڈاک ختم ہو گیا"۔

س :۔ "ہونے دو!"

آدمی :۔ "حضور ابھی ابھی خبر آئی ہے براعظم امریکہ کے پچاس شہر ختم ہو گئے۔ براعظم یورپ کے دو سو شہر تباہ ہو گئے۔ براعظم ایشیا کے تمام دارالخلافے آگ سے جل گئے۔ حضور جلدی کیجئے۔ دنیا امن چاہتی ہے۔ فوری امن!"

س :۔ "تم بیچ میں بولنے والے کون ہو۔ بیٹھ جاؤ!"

(آدمی مجبور ہو کے بیٹھ جاتا ہے)

ع :۔ "حضرات! میں کسی غیر جانبدار کمیشن کے حق میں ووٹ نہیں دے سکتا۔ اور خصوصاً ج چ ح خ کے حق میں، جو بہت ہی پسماندہ اور گرے ہوئے ملک ہیں۔ جن کی آبادی اسی فیصدی سے اوپر ان پڑھ ہے"۔

(کن فون والا آدمی پھر گھبرا کے کھڑا ہو جاتا ہے)

آدمی :۔ "حضور اسّی فیصدی ان پڑھ اور سو فیصدی پڑھے لکھے سب مر رہے ہیں۔ ہائیڈروجن بم پڑھے لکھے اور جاہلوں میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ افریقہ کے جنگلوں میں آگ لگی ہوئی ہے"۔

ع :۔ "مسٹر غ ! یہ آدمی کون ہے"

غ :۔ "کیوں مسٹر! تم کس ملک کے نمائندے ہو؟"

آدمی :۔ "حضور میں دنیا کا نمائندہ ہوں"

غ :۔ "مسٹر چیرمین ۔ میں پوچھ سکتا ہوں ، کیا اس نام کا کوئی ملک موجود ہے؟"

چیرمین :۔ "نہیں !"

ع :۔ "تو بیٹھ جاؤ ۔ بیچ میں مت بولو ۔ اس وقت زندگی اور موت کا سوال ہے ۔ جنگ اور امن کا سوال ہے ۔ ہم ساری دنیا کے سیاستداں امن چاہتے ہیں ۔ اور اس لئے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں ۔ ہمیں انسانیت کی فلاح و بہبود کا خیال ہے ۔ ہم ذمہ دار انسان ہیں اور انسانیت کے تئیں ہمارا جو فرض ہے ہم اسے کما حقّہ پورا کرینگے حاضرین میں آپ کے سامنے اس نازک موقع پر شیکسپیئر کے وہ الفاظ دہراتا ہوں۔ TO BE OR NOT TO BE "

(کن فون والا آدمی پھر کھڑا ہوتا ہے)

آدمی :۔ "حضور آپ شیکسپیئر دہرا رہے ہیں اور دنیا ختم ہوئی جا رہی ہے ۔ خدا کے لئے جلدی امن قائم کرنے کا فیصلہ کر لیجئے ۔ فوراً جنگ بند کرنے کا حکم دیجئے ورنہ بہت دیر ہو جائے گی ۔ ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ ....."

غ :۔ (زور سے چلّا کے) "ٹو بی آر ناٹ ٹو بی۔"

آدمی :۔ "حضور قطب شمالی کی برف پگھلنی شروع ہوگئی ہے۔"

غ :۔ "(زیادہ چلّا کے) "ٹو بی آر ناٹ ٹو بی!

آدمی :۔ "آسٹریلیا میں درجۂ حرارت دو ہزار سینٹی گریڈ پہنچ گیا ہے۔"

غ :۔ "ٹو بی آر ناٹ ٹو بی۔"

آدمی :۔ "ہندوستان خاموش ہے۔"

غ :۔ "ٹو بی آر ناٹ ٹو بی! میں ہملٹ کی پوری تقریر پیش کروں گا۔ یہ

میرا پیدائشی حق ہے۔"

آدمی :۔ "اب ساری دنیا خاموش ہے۔ کہیں سے کوئی آواز نہیں آتی۔"

(فون والا آدمی فون اتار کر میز پہ رکھ دیتا ہے۔ اور میز پہ سر جھکائے بانہوں میں سر چھپا کے سسکیاں لیتا ہے)

غ :۔ "ٹو بی آر . . . . ."

(مسٹر غین کی آواز گدھے کی بولی میں گم ہو جاتی ہے۔ گدھا زور زور سے ہنس رہا ہے)

گدھے کا بچہ نمبر ۴ :۔ "باپو تم ہنسنے کیوں لگے؟"

گدھا۔ "ہنسنے کا مقام ہے کہ رونے کا مقام ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کی دنیا ختم ہوگئی۔ لیکن ان کی کانفرنس ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔"

گدھا اپنے بچوں کو لے کے آگے بڑھ جاتا ہے۔

ماں اور بچّہ

اس پنجرے میں ایک ماں اپنے سر کے بال کھولے، ایک پالنے میں اپنے بچے کو جھلا رہی ہے اور لوری گا رہی ہے۔

سو جا ایٹم بم کے مارے سو جا

راج دلارے!

سو جا

بچہ بد شکل، بدہیئت اور کریہہ منظر ہے۔ اس کی ایک آنکھ ماتھے پہ ہے اور ایک ٹھوڑی پر۔ منہ میں زبان نہیں ہے۔ زبان دائیں کان کے اندر اُگی ہوئی ہے۔ اس کے بچّے کے تین بازو ہیں اور ایک ٹانگ ہے۔ اور دو سر ہیں۔ ایک سر کے اوپر سینگ اُگا ہے۔ دوسرے سر کے اندر ایک بازو آہستہ آہستہ ہل رہا ہے۔

گدھے کا بچہ نمبر ۱:۔ "باپو! کیا یہ انسان کا بچہ ہے؟"

گدھا:۔ "نہیں، یہ جہنم کا بیٹا ہے۔"

گدھے کا بچہ نمبر ۲:۔ "جہنّم کسے کہتے ہیں؟"

گدھا:۔ "بیٹا! ہر جاندار شے چھوٹے چھوٹے ذرّوں سے بنتی ہے جن کا ایک خاص درجۂ حرارت ہوتا ہے۔ جس کے اندر رہ کر وہ اپنی

شکل وصورت اور کیمیاوی صفات برقرار رکھتی ہے۔ لیکن اس درجۂ حرارت کو بہت زیادہ بدل دینے سے وہ اپنی شکل وصورت اور کیمیاوی صفات بھی بدل دیتی ہے۔ یہی انسانوں کے ساتھ ہوا۔ ایٹمی اور ہائیڈروجنی جنگ کے بعد جو یہ تھوڑے سے انسان بچے ہیں" یہ سب یا تو اندھے ہو گئے ہیں یا پاگل ہو گئے ہیں یا سرطان کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے کوئی نہیں بچے گا۔ دھیرے دھیرے اس چڑیا گھر کے تمام انسان فنا ہو جائیں گے۔ ہمارا خیال تھا شاید یہ عورت، جس کے پیٹ سے یہ بچہ پیدا ہوا ہے، شاید یہ عورت انسانی نسل کی افزائش میں مدد کرے گی۔ لیکن ہمارا یہ خیال غلط نکلا۔ ہائیڈروجنی حرارت نے تخلیق کے کیمیاوی عمل کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دئے ہیں۔ اس عورت کی کوکھ اندھی ہو چکی ہے۔

اب یہ ماں اپنی کوکھ سے شیکسپیئر، ٹیگور، گورکی، رومن رولاں، غالب، بوعلی سینا، لیونارڈو، ارزدری، اشوک، اکبر، کنفیوشس اور مسیح پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ صرف جہنم کا بیٹا پیدا کر سکتی ہے۔ انسان کی ٹریجڈی یہی ہے کہ جب اس کے سامنے زندگی اور موت کا سوال آیا، اس نے موت کو چن لیا۔ اس لئے اب

انسان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔"

(پردہ)

اختتامیہ

جب پردہ اُٹھتا ہے تو وہی زمین ہے، اپنے محور کے گرد گھومتی ہوئی۔ وہی آسمان ہے دودھیا کہکشاں والا۔ تاروں کی برات اُفق تا اُفق سجی ہوئی ہے۔ وہی آدمی، ایک آدمی، اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے، زمین کی طرف منھ کئے تماشائیوں کی طرف پیٹھ کئے کھڑا ہے۔

(اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسی کورس کی صدا فضائے بسیط میں گونج اُٹھتی ہے)

کورس:-

لیکن انسان مرا نہیں ہے۔

وہ تو ابھی تک زندہ ہے۔

اسی زمین پر رہتا ہے

ابھی تک یہ وہی زمین ہے۔

وہی فلک ہے

وہی دھرتی ہے۔

وہی دھرتی ہے۔
وہی خوشبو ہے۔
وہی شہد کی مکھی ہے۔
پھول وہی ہیں۔
اور شہتوت کے پتے وہی ہیں۔
اور ریشم کے جال وہی ہیں۔
اور ابھی تک بلبل نغمے گاتی ہے۔
اپنے مستقبل کی خاطر کلی کلی مسکاتی ہے۔
اور ماں اپنے سوئے ہوئے بچے کے بھولے چہرے میں۔
آنے والی جنّت کا نظارہ کرتی جاتی ہے۔
وقت ایک ماں ہے۔
اور تاریخ ایک پالنا ہے۔
بچّہ ایک خواب ہے۔
جنّت کا جہنّم کا!
کون سا خواب تمھارا ہے؟
جنّت کا؟ جہنّم کا؟
اے انسان، میرے بھائی!

میرے ساتھی!

میرے ہمدم، میرے دوست۔

کون سا خواب تمہارا ہے؟

فیصلہ یہ آج ہوگا۔

(کورس کی آخری آواز پر تماشائیوں کی طرف پشت کئے ہوئے جو آدمی کھڑا ہے، وہ تماشائیوں کی طرف گھومتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ اسٹیج کے مرکز کی طرف بڑھتا ہے۔ یہ آدمی سر سے پاؤں تک ایک نیلے کپڑے میں ملبوس ہے۔ اس کے چہرے پر بھی نیلی نقاب ہے، جس پر سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔ جب یہ آدمی بالکل اسٹیج کے مرکز میں آجاتا ہے تو اپنے دونوں ہاتھ تماشائیوں کی طرف بڑھا دیتا ہے اور تماشائی دیکھتے ہیں کہ اس آدمی کے ایک ہاتھ میں ہائیڈروجن بم ہے اور ایک ہاتھ میں امن کی فاختہ!!)

(پردہ)